Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱۶ نومبر ۲۰۱۶ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۹ ۔ شمارہ نمبر: ۲۲

پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

چیچنیا اور کریملن ایک راہ پر۔۔۔

پہلی قسط

Vadim Dubnov

اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی رمضان قادروف کی بھرپور کوشش کے باوجود ماسکو اور چیچنیا کے درمیان پرانے اطوار کے ساتھ کام کرنے کی روایت دم توڑتی جا رہی ہے۔ اب فریقین نے ایک نیا معاہدہ کر لیا ہے۔ بیس سال پہلے کے اور آج کے چیچنیا میں بہت فرق ہے۔ تم سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ ہر طرف تباہی کے آثار نمایاں تھے۔ آج چیچنیا مفاہمت کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ سب کچھ روس کے صدر ولادیمیر پوٹن اور موجودہ چیچن لیڈر رمضان قادروف کے والد احمد قادروف کے درمیان طے پانے معاہدے کا نتیجہ ہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد سے چیچنیا اور روس کے درمیان معاہدے پر عمل سے بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ چیچنیا میں تعمیر و ترقی کا کام بھی بے مثال رفتار سے ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چیچنیا اب بھی بہت حد تک ماسکو کی طفیلی ریاست معلوم ہوتی ہے۔ پہلے سے طے کردہ شرائط کے مطابق کام کرتے رہنے پر چیچن قائدین کو ڈیڑھ عشرے کے دوران ماسکو سے غیر معمولی مراعات دی جاتی رہیں۔

ماسکو اور چیچنیا کے درمیان معاہدہ غیر تحریری ہے مگر پھر بھی ۱۶ برس کے دوران یہ معاہدہ ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتا آیا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں احمد قادروف کا قتل بھی اس پر زیادہ اثر انداز نہ ہو سکا۔ اور پھر رمضان قادروف نے ۲۰۰۷ء میں اقتدار سنبھالا۔ اس دوران چیچنیا میں چند ایک قوتوں نے ماسکو سے معاہدے کی شدید مخالفت بھی کی ہے اور اس کے نتیجے میں ریاست کے طول و عرض میں اچھی خاصی کشیدگی بھی رہی ہے۔

رمضان قادروف نے ستمبر ۲۰۱۶ء میں تقریباً ۹۸ فیصد ووٹروں کی تائید سے ایک بار پھر چیچنیا کے قائد کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالی ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ کریملن کے پالیسی ساز چیچنیا سے تعلق رمضان قادروف کی شرائط پر نہیں چاہتے۔ خطے میں اپنی پوزیشن کو خطرات لاحق ہونے کے خوف سے ولادیمیر پوٹن نے چیچنیا سے معاہدے پر نظر ثانی کی ہے اور اس بار اپنی شرائط کو اولیت دی ہے۔

پہلا معاہدہ

عام تاثر یہ ہے کہ چیچنیا کے مسئلے نے روس کی طرف سے ۱۹۹۰ء میں متعارف کرائی جانے والی وفاق کی تحریک کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ تاتارستان کی مثال واضح ہے۔ اس نے رشین فیڈریشن سسٹم کو قبول کیا تو اسے وسیع تر خودمختاری ملی۔ چیچنیا نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ اس کے نتیجے میں تصادم کی کیفیت پیدا ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ چیچنیا کی قیادت اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ بدلتی ہوئی صورت حال میں کیا کرنا ہے، کون سا ماڈل اپنانا ہے۔ ایک طرف تو چیچنیا کے قائدین تاتارستان کے ماڈل کا ایک خاص تناظر میں حوالہ دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ چاہتے ہیں کہ چیچنیا مکمل خودمختاری سے ہمکنار ہو۔ کبھی اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ چیچنیا کو ایسی آزادی دی جائے جس میں سیاست اور معیشت پر اشرافیہ کا کنٹرول ہو۔ چیچنیا میں اب تک دو جنگیں لڑی جا چکی ہیں اور دونوں ہی جنگوں کے نتیجے میں چیچنیا کو کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ چیچن قائدین ماسکو سے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے آئے ہیں مگر معاملات وہیں کے وہیں ہیں۔

۲۰۰۰ء میں احمد قادروف کا چیچن لیڈر بنایا جانا دراصل روس کی چیچنائزیشن پالیسی کا تسلسل تھا۔ کریملن چاہتا تھا کہ علاقائی قائدین کو ان کے ہم نسل حریفوں سے متصادم کیا جائے۔ نومبر ۱۹۹۴ء میں چیچنیا کی پہلی جنگ کے موقع پر کریملن نے اس وقت کے چیچن سربراہ زوخار دودائیف کے مقابل اپوزیشن فورسز کو متحرک کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ یہ تجربہ ناکام ہونے پر ماسکو نے اپنی پسند کے چند چیچن لیڈروں پر مشتمل حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ پہلے مرحلے میں سلام بیگ خازبیئف کو وزیراعظم بنایا گیا۔ یہ سلسلہ چند ہی ماہ چلا۔ پھر ماسکو نے دوکوز وگائیف کو وزیراعظم مقرر کیا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ سلام بیگ خازبیئف اور دوکوز وگائیف میں سے کسی کا بھی اختیار دارالحکومت گروزنی سے باہر کچھ نہیں تھا۔ ماسکو نے چیچنیا کے مسئلے کا حل قدیم نوآبادیاتی انداز سے تلاش کرنے کی کوشش کی، جو بری طرح ناکام رہی۔

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تاتارستان کو تو اہمیت دی جاتی رہی مگر روسی قیادت نے چیچنیا کو کبھی وفاقی سطح کا بڑا مسئلہ سمجھنے کی

اندرونی صفحات پر:۔

- مصر حماس تعلقات میں بہتری
- ایران، امریکا اور مغرب: فطری اتحادی؟
- روس کا ''بند کمرا'' نظام
- ترکی: ''آیا صوفیا'' میں اذان کی گونج
- بنگلا دیش گلوبل راڈار سے غائب
- دہشت گرد کی پہچان
- اسلامی تحریکیں، شناخت کا بحران
- تبدیلی مگر کہاں اور کیسے؟
- ''ٹرمپ'' اور ''بریگزٹ'' نے نظام کو ہلا دیا!

زحمت گوارا نہ کی۔ بورس یلسن کے دور میں اور اس کے بعد ولادیمیر پوٹن کے ابتدائی دور میں چیچنیا کو خاطر خواہ اہمیت دینے سے گریز کیا جاتا رہا۔ چیچنیا کو روس کا باضابطہ حصہ بنانے اور اس کے حقوق دینے کے بجائے اس بات کو اہمیت دی گئی کہ نوآبادیاتی دور کے طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے چیچن قائدین کو آپس میں لڑایا جاتا رہے۔ اس کے نتیجے میں قتل و غارت ہوئی اور نتیجہ روس مخالف رجحانات کی شکل میں برآمد ہوا۔ چیچنیا میں لڑی جانے والی دو جنگوں کے دوران ماسکو نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا عمل جاری رکھا مگر یہ سب کچھ اسی کے خلاف گیا۔ ایک طرف تو چیچن اشرافیہ بری طرح منقسم ہو کر رہ گئی۔ آپس کی لڑائی نے شدت پکڑی تو پورا خطہ تباہی سے دوچار ہوا۔ ایسے میں روس کے خلاف جذبات کا ابھرنا حیرت انگیز نہ تھا۔ روس چاہتا تھا کہ چیچن صفوں سے اس کے لیے اتحادی ابھریں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کریملن کی پالیسیوں پر چیچن اشرافیہ کو زیادہ بھروسہ نہ تھا۔ چیچن قائدین اچھی طرح جانتے تھے کہ چیچنیا کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی خرابی ماسکو کی پیدا کردہ ہے۔ ماسکو کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ چیچنیا میں ایک گروپ کو دوسرے سے لڑایا جائے۔ اسی پالیسی کو بنیاد بنا کر پہلے احمد قادروف اور پھر اس کے بیٹے رمضان قادروف سے دوستی، مفاہمت اور اشتراکِ عمل کا معاہدہ کیا گیا۔

چیچنیا کی پہلی جنگ تو خرابیوں میں ختم ہوئی۔ دوسری جنگ کے آخری دور میں ماسکو کے لیے کچھ امید پیدا ہوئی۔ ماسکو کے پالیسی سازوں کی اولین ترجیح یہ تھی کہ چیچن صفوں سے ایک ایسی فورس ابھرے جو اس کی ہم نوا ہو اور روسی سیکیورٹی فورسز کے لیے اہم معاون کے طور پر خدمات انجام دے۔

ماسکو نے چیچنیا میں علیحدگی پسند لیڈر شامل بسائیف سے الگ ہو جانے والے یمدائیف برادران کو دائرۂ اثر میں لانے کو ترجیح دی۔ رسلان، زبریل اور سلیم یمدائیف کا گودرمیز کے کوہستانی علاقوں میں غیر معمولی اثر و رسوخ تھا۔ ان کے تجربے کو دیکھتے ہوئے ماسکو نے اس بات کو ترجیح دی کہ ان کے ذریعے اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چیچنیا میں بہت سے جنگجو روسی افواج کے خلاف بھی لڑتے رہے تھے مگر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی کہ ان میں سے بیشتر قازقستان میں پیدا ہوئے تھے، جو سوویت دور میں بالجبر ایک بڑے اتحاد کا حصہ بنایا گیا تھا۔

یمدائیف برادران نے احمد قادروف کو اپنے والد کے معاون کے روپ میں دیکھا۔ وہ صورت حال کو یوں لیتے تھے جیسے ایک کمزور سیاسی رہنما سے کوئی طاقتور قبیلہ اپنے معاملات طے کرتا ہے۔ اگر ماسکو نے احمد قادروف کو عسکری سطح پر مدد فراہم نہ کی ہوتی تو اس کے لیے بھی بہتر انداز سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوا ہوتا اور وہ چیچنیا پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوا ہوتا۔ ایسی صورت میں چیچنیا میں کئی بحران ایک ساتھ پیدا ہو جاتے اور ماسکو کے لیے معاملات کو کنٹرول کرنا پھر مزید دشوار ہو جاتا۔ احمد قادروف کو ماسکو سے بھرپور مدد نہ ملی ہوتی تو اس کی جگہ مذہبی رجحانات رکھنے والا کوئی ایسا رہنما اقتدار پر قابض ہو جاتا جو انتہا پسندی کو بہترین طریق کے طور پر اپناتا اور اپنی حکمرانی کو طول دیتا رہتا۔

دو جنگوں کے درمیانی وقفے میں چیچنیا تباہ شدہ حالت میں تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی حد تک سکون رہا۔ اسلان مسخادوف اور ان کے ساتھیوں کی کاوشوں سے معاملات کسی حد تک قابو میں رہے۔ اغواء برائے تاوان اور دیگر جرائم بھی رونما ہوتے رہے مگر پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ معاملات بہت خراب نہ تھے۔ اس کے بعد احمد قادروف کے بیٹے رمضان قادروف نے ماسکو کے تعاون سے اقتدار سنبھالا تو قدرے استحکام پیدا ہوا۔ اور ایسا دکھائی دینے لگا جیسے چیچنیا کی گاڑی دوبارہ راہِ راست پر آ گئی ہے۔ روس نے احمد قادروف سے جو معاہدہ کیا تھا وہ اب اپنی وقعت سے محروم ہو چکا تھا کیونکہ حالات اور معاملات بھی بہت حد تک بدل گئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان قادروف سے ماسکو نے نیا معاہدہ کیا۔

رمضان قادرف کی اپروچ

رمضان قادرف چیچنیا کے لیڈر کی حیثیت سے تیزی کے ساتھ اپنی اتھارٹی منوانے میں اس لیے کامیاب نہ ہوئے کہ ماسکو نے انہیں بالکل اسی طرح اتھارٹی نہیں دی، جس طور بیلاروس کے لیڈر الیگزینڈر لوکاشینکو کو دی گئی تھی۔ انسانی حقوق کے علم برداروں نے رمضان قادرف کے ارادوں سے ابتدا ہی میں خبردار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ کوئی دانشوری کی سطح پر نہیں آیا بلکہ اس کے واضح سیاسی عزائم ہیں۔

رمضان قادروف نے اس حقیقت کو کبھی نہیں چھپایا کہ اس نے کبھی روسی افواج کے خلاف بھی ہتھیار اٹھائے تھے۔ اس نے کئی بار یہ بات کھل کر بیان کی ہے کہ زوخار دودائیف نے جب چیچنیا کے نوجوانوں کو آزادی اور خود مختاری کے لیے ہتھیار اٹھانے کی تحریک دی تب اس نے بھی ہتھیار اٹھائے۔ اس نے ۱۶ سال کی عمر میں چیچنیا کی پہلی جنگ میں روسی افواج کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ مگر یہ کہ بعد میں جب اندازہ ہوا کہ روس کے ساتھ پرامن رہے بغیر بقا ممکن نہیں تب انہوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ چیچنیا میں اب بھی بہت سے نوجوان آزادی کا خواب دیکھتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ان کی سرزمین آزاد حالت میں جیے۔ مگر رمضان قادروف کے ذہن میں کوئی شک یا شبہ نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ روس کے ساتھ مل کر چلا جائے۔ نظریات وغیرہ کو اب بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ پرامن بقائے باہمی کے نام پر اقتدار کو برقرار رکھنا اب اولین ترجیح ہے۔

نظریات کو خدا حافظ

ایک زمانہ تھا کہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں اطلاق پذیر کرنے کی خواہش نے چیچنیا کو آزاد کرانے کی تحریک شروع کروائی تھی۔ اب ایسا نہیں رہا۔ اسلام کو زندگی کے ہر شعبے پر محیط دیکھنے والے اب بھی ہیں مگر خاصی کم تعداد میں۔ چیچنیا کی سرزمین کو نظریات سے مبرّیٰ کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ رمضان قادروف اور ان کی قبیل کے دیگر افراد یہ نہیں چاہتے کہ کسی بھی نظریے کو بنیاد بنا کر روس سے مزید لڑائی مول لی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ریاست قدرے خود مختار رہے اور روس کی تابعداری قبول کر لے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں چیچنیا میں آزادی کی جو لہر اٹھی تھی وہ کسی بھی اعتبار سے آزادی کی حقیقی خواہش کا مظہر نہ تھی بلکہ بہت حد تک سوویت یونین کی شکست و ریخت کا نتیجہ تھی۔ جب روسی افواج چیچنیا کے طول و عرض میں جمع ہونے لگیں تب چیچن نوجوانوں نے ہتھیار اٹھائے مگر یہ ہتھیار آزادی کے حصول کی خاطر نہ تھے بلکہ روسی افواج کا قبضہ روکنے کی خاطر تھے۔ پھر جب لڑائی نے زور پکڑا تو چیچنیا کے طول و عرض میں قومی آزادی کی لہر اٹھی اور اس کے نتیجے میں روسی افواج کے خلاف ایک باضابطہ جنگ شروع ہوئی۔

ابتدائی دور میں روسی افواج کے خلاف مزاحمت زیر زمین تھی۔ سب کچھ خفیہ طور پر ہوتا رہا۔ چیچنیا کے بہت سے نوجوان اپنی ریاست کو کسی بھی بیرونی قوت کے تصرف میں دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب باضابطہ مسلح جدوجہد شروع ہوئی تو بہت سے نوجوان تیزی سے اس کا حصہ بنتے گئے۔ ابتدائی دور میں مقاصد کچھ اور تھے۔ بہت سے سماجی اور علاقائی مسائل تھے مگر بعد میں یہ تمام مسائل پیچھے رہ گئے اور ایک اسلامی ریاست کا قیام مقصد بن کر دل و دماغ میں سما گیا۔ مگر خیر، یہ جوش و جذبہ زیادہ برقرار نہ رہ سکا۔ نظریاتی سطح پر زیادہ مدد مل سکی نہ عسکری پیمانے پر۔

ایسا نہیں ہے کہ چیچنیا کے عوام صرف لڑائی چاہتے تھے اور

روسی افواج کے خلاف مزاحمت ہی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ بیشتر چیچن باشندے زیادہ سے زیادہ شخصی آزادی کے طالب تھے اور ان میں سے بیشتر نے اس وقت سکون کا سانس لیا جب احمد قادروف کے زمانے میں لڑائی بند ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ احمد قادروف کوئی آئیڈیل شخصیت نہیں اور اس کے دور میں ریاست کے تمام مسائل حل نہیں ہو جائیں گے مگر وہ چاہتے تھے کہ جنگ وجدل سے جان چھوٹے اور نارمل زندگی کی طرف جانے کی راہ ہموار ہو۔ اس کے بعد وہ مرحلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ چیچنیا میں قوم پرست تحریک تھی جو آزادی کی بات کر رہی تھی اور دوسری طرف روسی حب الوطنی تھی۔ ایک وسیع تر وفاق میں رہتے ہوئے حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے پر زور دیا جا رہا تھا۔ اور یہ بھی فطری امر تھا۔ رشین فیڈریشن چاہتی ہے کہ جو بھی اس کے دائرے میں ہو وہ وطن سے محبت کی بات کرے، نظریات کی نہیں۔ نظریات کو ایک خاص حد تک قبول کیا جا سکتا ہے مگر وطن سے محبت سب پر مقدم ہے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ اسلام بھی رشین آرتھوڈوکس چرچ کے ماتحت آ گیا ہے یعنی چیچنیا اور تاتارستان کے باشندوں نے اسلام پسندی پر حب الوطنی کو ترجیح دے دی ہے۔

رمضان قادروف نے دو ایسی نسلیں دیکھی تھیں، جو روس کے خلاف لڑ چکی تھیں۔ اس نے ایسا قائدانہ انداز اختیار کیا جو بھرپور قوت کا حامل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ چیچنیا میں جنگ پسندی کا رجحان ختم ہو جائے۔ دوسری طرف کریملن نے بھی رمضان قادروف کی بھرپور مدد کی۔ کریملن چاہتا تھا کہ چیچنیا میں امن ہر قیمت پر برقرار رکھا جائے۔ وہ اس کی کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھا اور دی۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Chechnya's new contract with the Kremlin". ("carnegie.ru". October 27, 2016)

●●●

مصر حماس تعلقات میں بہتری

Adnan Abu Amer

حماس اور مصر کے درمیان برف پگھل رہی ہے، لیکن سب جانتے ہیں کہ مفاہمت کی جانب قاہرہ کی حالیہ پیش قدمی ضرور کسی مفاد کی بنیاد پر ہے۔ النجیہ (An-najah) یونیورسٹی، نابلس کے پروفیسر ایراط نے ''المانیٹر'' سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''مصر کی حماس سے مفاہمت کی جانب پیش قدمی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فلسطینی صدر محمود عباس پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے حریف محمد دحلان سے بات چیت کریں اور انہیں اپنا جانشین بننے کے لیے تیار کریں'' (یاد رہے کہ محمد دحلان کو محمود عباس پارٹی سے نکال چکے ہیں)۔

پروفیسر کہتے ہیں ''آنے والا وقت بتائے گا کہ مصر حماس شراکت داری صرف وقتی ہتھیار کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے یا پھر اس کی کوئی تزویراتی اہمیت بھی ہے۔ اور اسی سے پتا چلے گا کہ یہ تعلقات کس حد تک باہمی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ رفح کراسنگ کا مستقل کھلے رہنا اور غزہ کی طرف سے صنعا کی سیکیورٹی کی ضمانت ان باہمی مقاصد میں سرفہرست ہیں۔ ایک بات جو بالکل واضح ہے وہ یہ کہ اس مفاہمت کے درپردہ جو فعال شخصیت ہے وہ محمد دحلان کی ہے، جو غزہ اور حماس دونوں کے لیے قابل قبول ہیں''۔

حماس کو بھی اس بات کا علم ہے کہ قاہرہ حالیہ اقدامات سے دراصل حماس اور محمود عباس، دونوں محاذوں پر کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قاہرہ چاہتا ہے کہ حماس کے ساتھ فی الحال کسی بھی قسم کی محاذ آرائی سے بچا جائے، جب تک کہ محمود عباس کے ساتھ دحلان کے معاملہ پر اختلاف ختم نہیں ہو جاتا۔

مصر کی جانب سے غزہ کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کیے جانے والے حالیہ اقدامات عین اس وقت کیے جا رہے ہیں، جب قاہرہ کے ''فتح'' کے ساتھ تعلقات خراب ہو رہے ہیں۔ محمد دحلان کے معاملے پر مصری صدر سیسی اور فلسطینی صدر محمود عباس کے درمیان سرد مہری میں اضافہ ہوا ہے۔ حماس کی روایتی حریف ''الفتح'' اس وقت محمود عباس کی جانشینی کے معاملے پر اندرونی خلفشار کا شکار ہے (محمود عباس کی عمر ۸۱ برس ہو چکی ہے)۔

الفتح کی انقلابی کونسل کے معتمد ابو مقبول نے المانیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے حماس قاہرہ مفاہمت میں محمد دحلان کے کردار پر بات کرنے سے انکار کر دیا، لیکن ان کا کہنا تھا کہ ''ہم ایسی ہر کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں جس سے عربوں اور فلسطینیوں کے تعلقات بہتر ہوں، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فلسطین کی تقسیم کا خاتمہ ہو سکے، یعنی حماس اور الفتح کے درمیان فاصلے کم ہو سکیں، جو کہ ۲۰۰۷ء سے مدمقابل ہیں''۔

مصر نے تجارتی سرگرمیوں میں تیزی لانے کے لیے خیر سگالی کے طور پر ۳۰ اکتوبر کو ہونے والی اکنامک کانفرنس میں شرکت کے لیے غزہ سے ۱۰۰ کاروباری افراد کو دعوت دی۔ اس دعوت کا مقصد رفح کراسنگ سے تجارتی اشیا اور افراد کی آمد و رفت کو سہل بنانا بھی تھا۔

ایک طویل عرصے سے رفح کراسنگ پر مصر کی بے جا سختی فلسطینیوں میں مایوسی کا باعث بنی رہی ہے۔ اس لیے حال ہی میں جب مصر نے عارضی طور پر رفح کراسنگ کو طلبہ، بیمار افراد، غزہ سے باہر سے آئے افراد کے لیے کھولی تو اس اقدام کو سراہا گیا۔ ۱۶ سے ۲۳ اکتوبر کے درمیان تقریباً چار ہزار افراد نے غزہ سے رفح کراسنگ کو عبور کیا۔

مصر نے ۲۰ اکتوبر کو غزہ کے سات حجاج کرام کو بھی رہا کر دیا، جنھیں ۲۴ ستمبر کو سعودی عرب سے واپسی پر ممنوعہ اشیاء رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔

حماس قاہرہ تعلقات میں بہتری کا اندازہ اسرائیلی ویب گاہ المصدر کی اس خبر سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ حماس نے غزہ سے چار دہشت گردوں کو گرفتار کیا ہے، جو مصری فوج پر حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ تفتیش کاران سے داعش سے تعلقات کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ گرفتاریوں کے حوالے سے سرکاری ذرائع نے کوئی اعداد و شمار جاری نہیں کیے۔ صنعا کی خراب صورتحال کے تناظر میں اس خبر کو کافی اہمیت دی جا رہی ہے۔ حال ہی میں یعنی ۱۴ اکتوبر کو داعش نے مصری فوج پر حملہ کر کے ۱۲ اہلکاروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ دریں اثنا مصری فوج نے دعویٰ کیا ہے کہ غزہ کی سرحد کے قریب دہشت گردوں کی پناہ گاہ پر حملہ کر کے اسلحہ کا بڑا ذخیرہ تباہ کیا گیا ہے۔

اس طرح کے اقدامات سے لگتا ہے کہ دونوں طرف سے گرم جوشی دکھائی جا رہی ہے۔ حماس کے ترجمان سامح ابو زہری نے حال ہی میں المانیٹر سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''مصر سے بہتر تعلقات کے لیے مصری حکام اور حماس کے راہنماؤں میں رابطے رہے ہیں، حماس چاہتی ہے کہ مصر سے ایسے تعلقات قائم کیے جائیں جو فلسطینی عوام کے مفاد میں بھی ہو اور مصر کی تاریخی اہمیت اور کردار کو بھی برقرار رکھے۔ حماس قاہرہ سے مثبت اور بہتر تعلقات کی خواہش مند ہے۔ حال ہی میں حماس کی جانب سے ایک خیر سگالی کا وفد مصر بھیجنے کا فیصلہ ہوا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے تعلقات بہتری کی جانب گامزن ہیں''۔

حماس اور مصر کے تعلقات کے استحکام کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے، ان تعلقات کی پائیداری دوسرے بہت سے معاملات سے جڑی ہوئی ہے، جن میں صنعا کا امن و امان، رفح کراسنگ کا کھلے رہنا اور محمد دحلان کا کردار بھی شامل ہے۔ مصر اور حماس انسانی ہمدردی کی بنیاد پر تعلقات کو بحال رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہی تعلقات سیاسی و تزویراتی تعلقات میں بہتری کا باعث بنیں۔ (ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"The man behind potential breakthrough in Hamas-Egypt ties". ("Al-Monitor". Oct.31,2016)

ایران، امریکا اور مغرب: فطری اتحادی؟

ڈاکٹر ماجد رفیع زادہ

امریکا نے مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنی بنیادی پالیسیوں کو تبدیل کر دیا ہے۔ آئندہ چند برسوں کے دوران امریکا اور مغرب کی مشرقِ وسطیٰ سے متعلق پالیسی ایران پر مرتکز ہوگی اور وہ خطے میں ان کا تزویراتی اور جغرافیائی سیاسی اتحادی بن جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خطے میں پولیس مین بن جائے گا اور وہ یہ کردار ۱۹۷۹ء کے انقلاب سے قبل ادا کرتا رہا تھا۔

مگر اس سب کے باوجود سخت گیر ایرانی امریکا کے ایران سے متعلق ارادوں کے بارے میں سخت عدم اعتماد کا شکار ہیں۔ پھر بھی بظاہر یہی لگتا ہے کہ جلد یا بدیر امریکا اور ایران بالآخر معمول کے مکمل سفارتی تعلقات استوار کر لیں گے۔

تعلقات کی تاریخ

اگر ایران، مغرب اور امریکا، ایران تعلقات کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو یہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ایران صدیوں سے ۱۹۷۹ء تک مغرب کا اتحادی رہا ہے۔ درحقیقت ۱۹۷۹ء سے ایران اور مغرب کے درمیان جاری تناؤ کو (اسی سال برپا کردہ انقلاب کے اصولوں اور نظریاتی اختلافات کی وجہ سے) ایک انحراف سمجھا جائے گا اور اس کو ایک قدر خیال نہیں کیا جائے گا۔

ایران میں تیل اور گیس کے ذخائر کی دریافت سے قبل بھی متعدد وجوہ کی بنا پر مغربی طاقتیں ایران کی جانب اپنے ایک اتحادی، شراکت دار یا خطے میں پولیس مین کے طور پر دیکھتی رہی ہیں۔

سب سے پہلے، مغرب کے نقطۂ نظر سے ایران ایک اہم تزویراتی مقام پر واقع ہے اور وہ مشرق وسطیٰ کے عین وسط میں ہے۔ دوم، ایرانی آبادی غالب اکثریتی عرب آبادی والے خطے میں ایک نسلی اقلیت سمجھی جاتی ہے۔ مغربی طاقتیں ایک عرصے سے اقلیتوں کو اکثریت کے ساتھ طاقت کا توازن قائم کرنے کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں۔ ایران ایک مذہبی اقلیت کا بھی حامل ہے، یعنی سنی۔ اکثریتی خطے میں شیعہ رہ رہے ہیں۔

مزید ایران نے ہمیشہ طاقتور رہنے اور جدید فوجی صلاحیتیں حاصل کرنے کے لیے سرمایہ کاری کی ہے۔ ایران مشرقِ وسطیٰ کا دوسرا بڑا ملک اور خطے میں مصر کے بعد دوسرا بڑا گنجان آباد ملک ہے۔ عالمی سطح پر ایران آبادی کے اعتبار سے سترھواں اور دنیا کا اٹھارواں بڑا ملک ہے۔

تیل اور گیس کی دریافت کے بعد ایران کی مغرب کے لیے اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس وقت وہ دنیا میں گیس کے بڑے ذخائر رکھنے والا دوسرا بڑا اور تیل کے ذخائر کا حامل چوتھا بڑا ملک ہے۔ نیز ایران مشرق وسطیٰ کی دوسری بڑی معیشت ہے۔

امریکا، ایران: بنیادی تبدیلی

ایران کے بارے میں امریکا کی پالیسی میں حالیہ تبدیلی مذکورہ بالا عوامل کے علاوہ متعدد حالیہ پیش رفتوں کی بھی مرہونِ منت ہے۔

اوّل، امریکا کے نقطۂ نظر سے اگر بات کی جائے تو اس کے ہاں تیل کے ذخائر دریافت ہونے اور وہاں سے تیل نکالنے کے بعد اب واشنگٹن کو مشرق وسطیٰ کے کسی ایک ملک پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے کیونکہ اس کے اپنے پاس تیل کے بہت زیادہ ذخائر ہیں۔ چنانچہ امریکی لیڈروں کے تخمینوں کے مطابق اگر تیل کو نکالا جاتا ہے تو ایران اپنے تزویراتی، جغرافیائی سیاسی محل وقوع کی بدولت دوسرے ممالک کو اہمیت دینا شروع کر دے گا۔

دوم، امریکی لیڈروں کی نظر میں ایران کے پاس دنیا کے گیس کے دوسرے بڑے ذخائر ہیں اور ان سے امریکی اتحادیوں یعنی یورپی ممالک کو روس پر انحصار کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سے روس کے خلاف عالمی توازنِ اقتدار کو امریکا اور اس کے اتحادیوں کے حق میں کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

سوم، ایران پہلے ہی خطے کے متعدد ممالک (عراق، شام، لبنان، بحرین) میں اپنے گماشتوں، گماشتہ تنظیموں اور رابطوں کے ذریعے اپنا اثر و رسوخ بروئے کار لا رہا ہے۔ امریکا کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ ایران کے اتحادی کی حیثیت سے اور اس کی پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہوئے خطے میں اپنے اثر و رسوخ کو بالواسطہ طور پر مزید بڑھا سکے گا۔

چہارم، امریکا جب ایران کا اتحادی بن جائے گا اور اس کے ساتھ سفارتی تعلقات استوار کر لے گا تو پھر اس کو خطے میں دوسرے ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات کو منقطع کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ امریکا خطے میں ایران کے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھائے گا اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کے ساتھ سیاسی، اقتصادی اور سفارتی تعلقات کا بھی فائدہ اٹھائے گا۔ اس سے امریکا کے ہاتھ میں ایک طاقتور لیور آ جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو خطے میں سودے بازی کے لیے ایک ہتھیار بھی مل جائے گا۔

پنجم، ایران کے پاس نہ صرف طاقتور فوجی قوت (پاسدارانِ انقلاب ایران اور القدس فورس) اور جوہری صلاحیتیں ہیں بلکہ اس نے خطے میں اپنا اثر بڑھانے اور مخصوص سیاسی ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے دوسرے ملکوں (شام اور عراق) میں فوجوں کو برسرِ زمین بھیجنے پر بھی آمادگی ظاہر کی ہے۔

بہ الفاظ دیگر، امریکا اپنے جغرافیائی سیاسی مفادات کے لیے ایران کا اتحادی بن کر اس کی فوجوں کو استعمال کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ ایران کی مشرقِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ امریکا نواز سوسائٹی ہے۔

حالیہ پیش رفتوں کے بعد امریکا ایران کے حق میں اپنی مشرقِ وسطیٰ کی پالیسی میں تبدیلی کو ایک ترجیح قرار دیتا ہے۔ امریکا اور مغرب کے نقطۂ نظر سے ایران ان کا فطری اتحادی ہے اور جیسا کہ وہ صدیوں تک رہا ہے۔ ایران کی گذشتہ چند عشروں کے دوران امریکا اور مغرب کے ساتھ کشیدگی محض ایک تبدیلی تھی، ایک قدر نہیں تھی۔ امریکا کی پالیسی میں تبدیلی کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اگر واشنگٹن ایران کے ساتھ مکمل سفارتی تعلقات استوار کرتا ہے تو ممکن ہے کہ خطے میں دوسرے ممالک شاید امریکا کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لیں۔

جغرافیائی، سیاسی، اقتصادی اور تزویراتی مفادات

مزید امریکا کو ایران کے بارے میں اپنی پالیسی میں ایک بنیادی تبدیلی بھی لانا ہوگی تاکہ وہ اپنے طویل المیعاد جغرافیائی، سیاسی، اقتصادی اور تزویراتی مفادات کا تحفظ کر سکے۔ صدر براک اوباما نے متعدد مرتبہ ایرانی قیادت کی جانب مکمل سفارتی تعلقات کی بحالی کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے، مگر ایران نے ہر مرتبہ اس دعوت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس کے باوجود بھی امریکا اس کی جانب ہاتھ بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

ایران کے سخت گیروں (بالخصوص سپریم لیڈر آیت اللہ علی خامنہ ای اور پاسداران انقلاب کی سینئر قیادت) کو اب بھی امریکا پر اعتماد نہیں ہے اور ان میں بعض غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، لیکن امریکا اس بات سے آگاہ ہے کہ جلد یا بدیر سرکردہ سخت گیروں کو منظرنامے سے ہٹا دیا جائے گا اور امریکا اور ایران ۱۹۷۹ء سے ماقبل کے دور کی جانب لوٹ جائیں گے، جب ایران خطے میں امریکا کا پولیس مین تھا۔

حرفِ آخر یہ کہ مغربی طاقتیں اگر ایران کی بالادستی قائم کرنے کی خواہشات اور ارادوں کے حوالے سے خطے کی دوسری طاقتوں کی تشویش کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہیں تو اس سے خطہ مزید عدم استحکام سے دوچار ہوگا اور خطے میں سکیورٹی کا مسئلہ دو چند ہو جائے گا۔ نتیجتاً علاقائی کشیدگی بارود کا ڈھیر بن سکتی ہے۔

(بحوالہ: ''العربیہ ڈاٹ نیٹ''۔ ۲۹ اکتوبر ۲۰۱۶ء)

روس کا ''بند کمرا'' نظام

روس کے معروف ادیب دستوویسکی نے اپنے معرکتہ الآرا ناول ''دی برادرز کرامو زوف'' میں لکھا ہے کہ اسرار، معجزہ اور اختیار۔ یہ تینوں چیزیں انسان کا ضمیر زندہ رکھتی ہیں۔ ولادیمیر پوٹن نے ان تینوں خصوصیات کو اپنے وجود میں جمع کرلیا ہے۔ ویسے تو وہ تینوں ہی معاملات میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں مگر معاملات کو پر اسرار رکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ وہ ہر کام کی بات کو یوں صیغۂ راز میں رکھتے ہیں کہ دنیا دیکھتی اور سوچتی ہی رہ جاتی ہے۔ کسی کو یہ معلوم ہو پاتا ہے کہ کریملن کی دیواروں کے پیچھے کیا چل رہا ہے نہ یہ معلوم ہو پاتا ہے کہ پوٹن کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ ایک بات البتہ واضح ہے کہ روس میں اختیارات اب سمٹ کر پوٹن کی ذات میں جمع ہو گئے ہیں، جو ظاہر ہے، انتہائی خطرناک ہے۔ کے جی بی کا دور گزرنے کے بعد ایف ایس بی کو ملک کا خفیہ نظام چلانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ خفیہ ادارہ اب پولیس سمیت تمام اداروں پر حاوی ہے۔

پوٹن کو کے جی بی دور کے ساتھیوں پر بھروسہ ہے اور انہی کو آگے لایا جاتا رہا ہے۔ روس سے کرائمیا کے الحاق کے بعد اب معاملات بہت کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ ایف ایس بی کو سیاسی اور معاشی معاملات میں بھی دخل دینے کا موقع مل گیا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جوزف اسٹالن کے انتقال کے بعد کے جی بی کے کنٹرول میں تھوڑی کمی آئی۔ اس کے لیے ایک خاص حد سے آگے آنا ممکن نہ ہوسکا۔ ۱۹۹۱ء میں روس کی کمیونسٹ پارٹی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کے جی بی کے لیے بھی پہلے سے اختیارات کے ساتھ کام کرنا ممکن نہ رہا۔ پھر بھی اس کی ضرورت اور گنجائش باقی رہی۔ نئے حکمرانوں نے کے جی بی کو ختم کرنا مناسب نہ جانا۔ سچ یہ ہے کہ نظریے کے بغیر کمیونسٹ پارٹی تو ختم ہوسکتی تھی اور ہوئی مگر کے جی بی یعنی خفیہ نیٹ ورک کو کسی نظریے کی حاجت تھی نہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جو لوگ کے جی بی میں تھے وہ ایف ایس بی میں آگئے۔ ایف ایس بی بہت حد تک ذاتی نوعیت کی فورس ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے بیشتر معاملات انتہائی خفیہ رہتے ہیں۔ بند کمرے کے اجلاسوں میں جو کچھ بھی طے کیا جاتا ہے وہ باہر نہیں آپاتا۔ روس کے عسکری اور معاشی امور کے ماہر آندرے سلدا توف کہتے ہیں کہ ایف ایس بی کو روس میں بہت حد تک وہی مقام حاصل ہے، جو امریکا میں ایف بی آئی کو حاصل ہے۔ پراسیکیوشن آفس کو ایف ایس بی سے کسی بھی معاملے میں کوئی وضاحت طلب کرنے کا اختیار نہیں۔ عدالتیں بھی وہی کرتی ہیں جو ایف ایس بی چاہتی ہے۔

۱۶ ستمبر ۲۰۱۶ء کو پارلیمانی انتخابات کے موقع پر روس کے روزنامہ ''کامرسینٹ'' نے اطلاع دی کہ کریملن نے سابق کے جی بی کے بعض حصوں (بشمول فارن انٹیلی جنس سروس اور اعلیٰ سرکاری افسران کی سیکیورٹی پر مامور فیڈرل پروٹیکشن سروس) کو ملا کر ایک نیا میگا سیکیورٹی اسٹرکچر ترتیب دیا ہے، جسے دی منسٹری آف اسٹیٹ سیکیورٹی کہا جائے گا۔ جوزف اسٹالن کے دور میں کے جی بی کو یہی کہا جاتا تھا۔ اور پھر دی منسٹری آف اسٹیٹ سیکیورٹی کی تشکیل کا موقع دیکھیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پارلیمنٹ جیسے مقتدر ادارے کو بھی ایف ایس بی کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے۔ کارنیگی ماسکو سینٹر سے وابستہ تاتیانا استانووایا کا کہنا ہے کہ اب تمام اہم فیصلے ایف ایس بی کرے گی اور پارلیمان اس کے لیے محض ربر اسٹیمپ کا کردار ادا کرے گی۔

اس وقت ایف ایس بی میں سرگئی کوروولیف کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ وہ انٹرنل سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کا سربراہ رہا ہے۔ یہ ادارہ کسی بھی خفیہ ادارے سے وضاحت طلب کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ سرگئی کوروولیف کو اہم کاروباری سرگرمیوں کا نگران مقرر کیا گیا ہے۔ چند برسوں کے دوران گورنرز، میئرز اور اعلیٰ پولیس افسران کی گرفتاریوں میں اس ادارے کا ہاتھ رہا ہے۔ یہ گرفتاریاں بظاہر کرپشن کی روک تھام کے نام پر کی گئی ہیں۔ گرفتاریوں کا سلسلہ وزارت داخلہ میں اکنامک کرائم اینڈ اینٹی کرپشن یونٹ کے سربراہ جنرل ڈینس سگرایوف اور اس کے نائب بورس کولیسنیکوف کی گرفتاری سے شروع ہوا۔ انہیں کرپشن کے خاتمے کی ذمہ داری روس کے موجودہ وزیر اعظم دیمیتری میدویدیف نے سونپی تھی۔ کولیسنیکوف کو اسیری کے دوران قید خانے میں سَر میں شدید زخم آئے۔ اور پھر چھ ہفتوں بعد رسمی تفتیش کے دوران اس نے چھٹی منزل سے کود کر خودکشی کرلی۔ سگرایوف جیل میں ہے۔

گورنرز، میئرز اور اعلیٰ پولیس افسران کے گھروں پر چھاپے مارے جاتے ہیں اور انہیں ہتھکڑیاں پہنا کر لے جایا جاتا ہے۔ یہ تمام مناظر ٹی وی پر عام ہیں۔ عام روسی بھی یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور اس کا اثر بھی قبول کرتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی پولیس افسر کے گھر پر چھاپا مارا گیا اور وہاں سے بڑے پیمانے پر نقدی برآمد ہوئی۔ پولیس کے ایک کرنل دیمتری سکھاراچینکو کے گھر پر چھاپا مارا گیا تو وہاں سے ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر برآمد ہوئے۔ چند ہفتے قبل کے جی بی کے سابق افسر اور کسٹمز سروس کے سربراہ کے گھر پر چھاپا مارا گیا تو وہاں سے ۶ لاکھ ۷۰ ہزار ڈالر کے علاوہ ایک کلوگرام سونا اور چند قیمتی تصاویر بھی برآمد ہوئیں۔

اسے برطرف تو کردیا گیا مگر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا یعنی اس کے خلاف کوئی قانونی یا عدالتی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

جو کچھ بھی کرپشن کو ختم کرنے کے نام پر کیا جاتا ہے اس پر لوگوں کو پورا یقین نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ معاملات جیسے دکھائی دے رہے ہیں ویسے نہیں ہیں۔ چھاپوں کے بعد بہت سوں کو کلین چٹ دے دی جاتی ہے۔ بہت سے معاملات میں کارروائی بھی نیم دلانہ سی ہوتی ہے۔ ایف ایس بی کا بھی وہی طریقہ ہے جو اسٹالن کا تھا۔ اسٹالن کے دور میں اندرونی سطح پر بھی غیر معمولی دباؤ برقرار رکھا جاتا تھا۔ اشرافیہ کو قابو میں رکھنے کے لیے لازم تھا کہ اس پر دباؤ بڑھایا جائے۔ گورنرز، میئرز اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں پر اسی لیے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ کوروولیف اور دیگر کو استعمال کرکے خود ایف ایس بی کی صفوں میں بھی غیر یقینی کیفیت اور خوف کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

صدر پوٹن نے اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ کوئی بھی بڑا کاروباری ادارہ نگرانی کے دائرے سے باہر نہ رہے۔ کے جی بی کے دور کی طرح اب بھی ہر بڑے کاروباری ادارے کی نگرانی پر ایک افسر کو مامور کیا جاتا ہے۔ صدر پوٹن نے معاملات کو اپنی ذات تک محدود و مرتکز رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جن لوگوں نے ولادیمیر پوٹن کے ساتھ کیریئر کی ابتداء کی تھی اُن میں سے بیشتر کو ہٹا دیا گیا ہے۔ صدر پوٹن نے کوشش ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے کم ہی لوگ میدان میں رہیں۔ انہوں نے اپنے ابتدائی دور کے بہت سے ساتھیوں کو فارغ کرنے میں تساہل سے کام نہیں لیا۔ کے جی بی کے سابق افسر جنرل سرگئی ایوانوف ایک مدت تک پوٹن کے چیف آف اسٹاف رہے مگر پھر ہٹا دیے گئے۔ اینٹی ڈرگ ایجنسی کے سابق سربراہ وکٹر ایوانوف اور فیڈرل پروٹیکشن سروس کے سابق سربراہ ایوگینی موروف کو بھی فارغ کردیا گیا۔

پوٹن نے بہت سے نوجوانوں کو بھی پروموشن دی ہے تاکہ وہ احسان تلے دبے رہیں اور کبھی خلاف جانے کی کوشش نہ کریں۔ وہ کریملن میں اپنا واضح حلقۂ اثر قائم کرنے کی کوشش میں اب تک کامیاب رہے ہیں۔ پوٹن کا نیا چیف آف اسٹاف ۴۴ سالہ اینٹن وائنو ہے جو سوویت دور میں ایسٹونیا سے تعلق

رکھنے والے کمیونسٹ لیڈر کا پوتا اور تیسری نسل کا بیوروکریٹ ہے۔ بہت سے سوبلینز کو کریملن کے معاملات چلانے کے لیے لایا گیا ہے اور دوسری طرف سابق فوجیوں اور کے جی بی کے ریٹائرڈ افسران کو کاروباری و مالیاتی اداروں کی نگرانی کا ٹاسک سونپا گیا ہے۔ ''اولڈ سلوویکی'' کے بچوں کو بینک اور قدرتی وسائل کے سرکاری ادارے چلانے کے لیے آگے لایا گیا ہے۔ موروف کا بیٹا فیڈرل گرڈ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا سربراہ ہے۔ یہ ادارہ روس میں بجلی کی فراہمی کا سب سے بڑا نیٹ ورک ہے۔ سیکیورٹی کونسل کے سربراہ نکولائی پیتروتیف کا بیٹا دیمتری پیتروتیف سرکاری ملکیت والے رشین ایگریکلچرل بینک کا سربراہ ہے۔

سابق سوویت یونین میں ذاتی اثاثوں کی منتقلی بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے سربراہان کے مرنے پر ان کی املاک اولاد یا بیوی تک مشکل سے منتقل ہوتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۹۱ء میں برپا ہونے والے انقلاب کا پارٹی رہنماؤں نے بھی خیر مقدم کیا۔ آج روس میں بڑے پیمانے پر ترکے کی منتقلی مشکل نہیں مگر اس کے لیے صدر پوٹن کی طرف سے گرین سگنل کا ملنا لازم ہے۔

سکیورٹی سیٹ اپ میں پھر تبدیلی کی گئی ہے۔ پوٹن کے سابق باڈی گارڈ وکٹر زولوتوف کو نیشنل گارڈ کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ فورس ۲۵ ہزار تا ۴۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ۹ لاکھ ۳۰ ہزار نفوس پر مشتمل باضابطہ فوج سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نیشنل گارڈ کا سربراہ براہِ راست پوٹن کو رپورٹ کرتا ہے۔

عسکری امور کے روسی تجزیہ کار الیگزینڈر گولز کہتے ہیں کہ نیشنل گارڈ کے قیام کا بنیادی مقصد حکومت کا تختہ الٹنے کی کسی بھی بڑی کوشش کو کامیاب ہونے سے روکنا ہے۔ یوکرین میں جو کچھ ہوا اُسے بنیاد بنا کر بنائی جانے والی اس فورس کا طریق کار بھی وہی ہے جو عام طور پر ایسے حالات میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اگست ۱۹۹۱ء میں جو انقلاب برپا ہوا وہ یہ بات سکھانے کے لیے کافی تھا کہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں باضابطہ فوج عوام کے خلاف طاقت استعمال کرنے کے معاملے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی ہے۔ نیشنل گارڈ کے قیام کا ایک بنیادی مقصد پوٹن کو تحفظ فراہم کرنا بھی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اُسے ایف ایس بی کو متوازن رکھنے میں بھی کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ کسی بھی بند نظام میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمام ادارے ایک دوسرے کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Wheels within wheels". ("Economist". Oct.22,2016)

ترکی: ''آیا صوفیا'' میں اذان کی گونج

غلام نبی مدنی

ترکی کے شہر استنبول میں جامع مسجد سلطان محمد کے قریب واقع ''آیا صوفیا'' ایک شاندار تاریخی عمارت ہے، جسے مشہور عیسائی بادشاہ قسطنطین کے بعد بازنطینی عیسائی بادشاہ جسٹنین اول نے ۵۳۲ء میں دوبارہ تعمیر کروایا۔ پانچ سال مسلسل اس کی تعمیر جاری رہی۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد ۵۳۷ء میں باقاعدہ طور پر اسے چرچ کا درجہ دے کر عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ ''آیا صوفیا'' دنیا میں فن تعمیر کا ایک منفرد عالیشان جہاں لیے ہوئے ہے، جسے رومی اور ترک انجینئروں نے اپنے اپنے دور میں کمالِ مہارت سے دنیا کا آرکیٹکچر فن پارہ بنایا۔ آج بھی دنیا سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں سیاح فنِ تعمیر کے اس عجوبے کو دیکھنے آتے ہیں اور معماروں کی کمالِ مہارت کی داد دیے بنا نہیں رہتے۔

آیا صوفیا پر کئی مشکل دور آئے، صلیبی جنگوں کے دوران خود عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے اس کو شدید نقصان پہنچایا۔ آخری بار ۱۳۴۶ء میں اس کی تعمیر کی گئی۔ بعد ازاں عثمانی دورِ خلافت میں اس کی تعمیر و ڈیزائن میں ترمیم ہوتی رہی۔ سلطان محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد پہلی مرتبہ اسے مسجد کا درجہ دیا اور یہاں نماز ادا کی۔ انہوں نے اس پر ایک شاندار مینار تعمیر کروایا، پھر بایزید ثانی کے دور میں اس کا ایک اور بلند مینار بنایا گیا۔ اس وقت آیا صوفیا کے چار بڑے مینار ہیں۔

۴۸۱ سال تک یہاں مسلمان اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے رہے۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں کمال اتاترک نے اپنی روشن خیالی اور اسلام دشمنی کی وجہ سے جہاں ترکی میں دیگر مساجد میں اذان اور نمازیں پڑھنے پر پابندی لگائی، وہیں آیا صوفیا میں بھی نماز اور اقامت پر پابندی لگا کر اسے ایک میوزیم قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں آیا صوفیا کے ساتھ جڑے ہونکار نامی محل کی مسجد بنائی گئی، جس کے دروازے آیا صوفیا کی طرف کھولے گئے، جہاں لوگ نماز پڑھتے رہے۔ دوسری طرف طیب اردوان کے دور میں جہاں رفتہ رفتہ دیگر اسلامی شعائر آزاد ہوتے رہے، وہیں آیا صوفیا کو بھی مسجد کی حالت پر واپس لانے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ ۲۰۱۴ء میں اناطولین یوتھ ایسوسی ایشن نے آیا صوفیا کو سابقہ حالت پر واپس لانے کے لیے زبردست تحریک چلائی، جس کا نام تھا ''اپنے مصلے لے کر آیا صوفیا پہنچو''۔ اس تنظیم کے بقول ''آیا صوفیا'' کو مسجد والی حالت میں واپس لانے کی اس تحریک میں ۱۵ ملین سے زائد لوگوں نے دستخط کیے جس کے بعد اس دور کے ترک وزیر اعظم احمد داؤد اوغلو نے یقین دلایا کہ معاملے پر غور کیا جائے گا۔ چنانچہ اب طیب اردوان کی حکومت نے اپنا تاریخی فیصلہ سناتے ہوئے آیا صوفیا کو بطور مسجد بحال کر کے باقاعدہ امام مقرر کر دیا ہے۔ ۸۲ سال بعد پہلی مرتبہ مسلسل پانچوں نمازوں کے لیے آیا صوفیا کے چار میناروں سے اذان کی آواز گونجے گی اور مستقل نمازیں پڑھی جائیں گی۔ ترک حکومت کے اس تاریخی فیصلے کے بعد عالم اسلام بالخصوص ترک اسلام پسندوں میں خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے، جبکہ دوسری طرف مغرب میں اس پر کافی تشویش پائی جا رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد فاتح کی شاندار فتح کے بعد یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر کنٹرول آ گیا تھا، اکثر عیسائی یہاں سے چلے گئے اور جو بچے انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر یہ خدا کی زمین ہے جس کی نیابت خدا اپنے ایمان والے بندوں کو دیتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے نہ صرف یہ ایک تاریخی جگہ ہے، بلکہ خدا کی طرف سے نیابت میں دی ہوئی ایک عظیم نعمت ہے، جس کے لیے ان کے آباء اجداد نے قربانیاں دیں۔ بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قسطنطنیہ فتح کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری سے نوازا۔ مغرب اگر آیا صوفیا میں عبادت پر نالاں ہے تو اسے کم از کم اپنے دہرے رویے پر غور کرنا چاہیے، جہاں قرطبہ میں مسجدوں کو گرجا گھر بنا دیا گیا اور مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا جاتا رہا، بلکہ آج بھی مغرب کے ہاں مذہبی آزادی نہیں، مسلمانوں کو حجاب اور نسلی تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جبکہ سلطان فاتح نے عیسائیوں کے ساتھ بے انتہا حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا، قیدیوں کو رہا کیا اور انہیں پُر امن ہجرت کی اجازت دی۔

ترکی میں طیب اردوان حکومت اسلام کے لیے کافی کوششیں کر رہی ہے۔ تعلیمی اور سرکاری اداروں میں حجاب پر پابندی اٹھانا، مساجد اور مدارس کو دینی تعلیم کے لیے آزادی دینا اور کمال اتاترک کی جانب سے اسلامی شعائر پر لگائی گئی پابندیوں کا اٹھانا، پھر دنیا کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنا نہایت مستحسن اقدام ہے۔ طیب اردوان حکومت کے انہی اچھے اقدامات کی وجہ سے ترک عوام نے انہیں مسلسل تیسری بار حکومت کے لیے منتخب کیا اور ماضی قریب میں ہونے والی بغاوت کو ٹینکوں کے سامنے لیٹ کر کچلا۔

(بشکریہ: سہ روزہ ''دعوت''، دہلی۔ ۱۰ر نومبر ۲۰۱۶ء)

بنگلا دیش گلوبل راڈار سے غائب

بنگلا دیش کو قائم ہوئے کم وبیش ۴۴ سال ہو چکے ہیں مگر اب تک اس کی معیشت اور معاشرت نے مجموعی طور پر وہ کیفیت اختیار نہیں کی ہے، جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ وہ ایک بھرپور اور کامیاب ملک ہے۔ آیے، شرحِ پیدائش، انسانی وسائل اور میڈیا کی آزادی کے حوالے سے بنگلا دیش کے اب تک کے سفر کا جائزہ لیں۔

بنگلا دیش کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ ایک طرف معیشت کی خرابی ہے اور دوسری طرف معاشرت کی بگڑتی ہوئی کیفیت۔

شرحِ پیدائش کا مسئلہ

کسی زمانے میں مشرقی پاکستان کہلانے والے اس ملک میں روس یا جاپان سے زیادہ لوگ بستے ہیں۔ شرحِ پیدائش کے عالمی اوسط سے بنگلا دیش نیچے ہے۔ آبادی کے اعتبار سے بنگلا دیش دسویں نمبر پر ہے۔ اوسطاً ہر ۱۱۷ء۱ مربع کلومیٹر میں کم وبیش ۲۸۹۴ نفوس بستے ہیں۔ خاصا بڑے رقبے کا حامل ہونے کے باوجود بنگلا دیش کا شمار چھوٹے جزائر پر مشتمل اقوام یا پھر شہری ریاستوں والے ممالک میں ہوتا ہے۔

اس وقت بنگلا دیش میں شرحِ پیدائش ۲ء۲ بچے فی عورت ہے، جو عالمی اوسط ۵ء۲ سے خاصا کم ہے جبکہ پاکستان میں شرحِ پیدائش ۶ء۳ بچے فی عورت ہے۔ یہ شرحِ پیدائش بنگلا دیش کو افزائشِ آبادی کے لحاظ سے ۹۴ ویں نمبر پر رکھتی ہے۔

افلاس کی شرح کے آئینے میں دیکھا جائے تو بنگلا دیش میں آبادی میں اضافے کی شرح کم ہے۔ ۲۰۵۰ء تک بنگلا دیش کی آبادی میں ۲۵ فیصد اضافہ ہو چکا ہوگا۔ یعنی اس وقت ارجنٹائن کی جتنی آبادی ہے تقریباً اُتنے ہی (چار کروڑ تیس لاکھ) نفوس بنگلا دیش کا حصہ بن چکے ہوں گے۔

۲۰۵۰ء میں بنگلا دیش کی آبادی ۲۰ کروڑ ۲۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہوگی اور یہ آبادی تب کے جرمنی، برطانیہ اور اٹلی کی آبادی کے مجموعے کے برابر ہوگی۔

بنگلا دیش ۱۹۷۱ء میں منصۂ شہود پر ابھرا۔ ۱۹۵۰ء میں یہ مشرقی پاکستان تھا۔ تب اِس کی آبادی ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ تھی۔ مغربی پاکستان کی بھی اُس وقت کم وبیش اتنی ہی آبادی تھی۔ پاکستان نے ۱۹۸۷ء میں آبادی کے معاملے میں بنگلا دیش کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس وقت پاکستان کی آبادی بنگلا دیش کی آبادی سے ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ زائد ہے۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان سے الگ ہو جانے کے بعد جب مشرقی پاکستان نے بنگلا دیش کا روپ دھارا تب اس کے ابتدائی حکمرانوں نے خاندانی منصوبہ بندی یعنی ضبطِ تولید پر غیر معمولی توجہ دی، جس کے نتیجے میں آبادی میں اضافے کی شرح کم ہوگئی۔ پاکستان نے ضبطِ تولید کے حوالے سے اقدامات کی ابتدا ۱۹۹۰ء کے عشرے میں کی۔

صنعت وتجارت

بنگلا دیش عالمگیر سپلائی لائن کا حصہ ہے۔ آزاد منڈی کی معیشت کے اصول کو اپنانے کے حوالے سے عالمی بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ کے طے کردہ پروگراموں سے بنگلا دیش میں صنعتی عمل کسی حد تک جڑ پکڑنے میں کامیاب رہا ہے۔ گارمنٹس کی صنعت نے زور پکڑا تو ملک بھر میں روزگار کے بہتر اور زائد مواقع پیدا ہوئے۔ خواتین کو بھی گھر سے نکلنے اور زیادہ موثر انداز سے معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔

عالمی اداروں کے زور دینے پر جو اصلاحات معیشت میں نافذ کی گئیں، ان کی بدولت بنگلا دیش میں صنعتی عمل تیز ہوا۔ اس کے نتیجے میں روزگار کے بہتر مواقع پیدا ہوئے اور یوں زیادہ بنگلا دیشیوں کے لیے معاشی امکانات دکھائی دیے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ایک افسوس ناک بات یہ بھی ہوئی کہ موثر قوانین اور ان پر عمل نہ ہونے کے باعث مزدوروں کے استحصال کی راہ مسدود نہ کی جا سکی۔ بیشتر صنعتی اداروں میں حفاظتی انتظامات ناقص ہیں۔ بہت سے ادارے مغربی اداروں کی ایما پر خاصے ڈھکے چھپے انداز سے کام کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں محنت کشوں کو ان کی محنت کا کما حقہ صلہ مل پاتا ہے نہ وہ بہتر حفاظتی انتظامات کے تحت کام کرتے ہیں۔ بنگلا دیش کے صنعتی اداروں میں بہت سے بڑے حادثات ہو چکے ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں ساور کی گارمنٹس فیکٹری کا گرنا اس کی ایک روشن مثال ہے۔

۲۰۱۶ء کے دوران امریکا اور یورپ کے لیے بنگلا دیش کی گارمنٹس کی برآمدات میں اضافہ ہی ہوا جبکہ خطے کے دیگر ممالک نے متعلقہ برآمدات میں گراوٹ محسوس کی۔ بنگلا دیش میں محنت کشوں کا استحصال آج بھی بڑے پیمانے پر جاری ہے، اور دوسری طرف ماحول کو پہنچنے والے نقصان کا سدِ باب کرنے میں بھی زیادہ کامیابی نہیں مل سکی ہے۔

میڈیا کی آزادی

بنگلا دیش میں میڈیا کی آزادی کا معاملہ بھی خاصا متنازع ہے۔ صحافیوں کی عالمی تنظیم ''رپورٹرز وداؤٹ بارڈرز'' نے ۲۰۱۶ء میں میڈیا کی آزادی کے حوالے سے کی جانے والی ۱۸۰ ممالک کی رینکنگ میں بنگلا دیش کو ۱۴۴ ویں نمبر پر رکھا ہے۔ بھارت ۳۳ ویں اور پاکستان ۱۴۷ ویں نمبر پر ہے۔

اگر بنگلا دیش میں کوئی صحافی مذہب یا آئین کے معاملے میں سیلف سینسر شپ کے مرحلے سے نہ گزرے یعنی غیر ذمہ دارانہ انداز سے کچھ لکھ ڈالے یا بول دے تو ریاستی مشینری اسے سزا دے سکتی ہے اور اس سے بھی زیادہ بُری اور خطرناک بات یہ ہے کہ مذہب کے خلاف کچھ لکھنے کی پاداش میں مقامی یا دیسی انتہا پسند قتل بھی کر سکتے ہیں۔ بعض صحافتی جرائم سزائے موت پر بھی منتج ہوتے ہیں۔

دی کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس نے بتایا ہے کہ ۲۰۱۵ء کے دوران بنگلا دیش میں ۷۱ صحافیوں کو کسی نہ کسی وجہ سے قتل کیا گیا۔ ان میں چار بلاگر اور ایک پبلشر بھی شامل ہے، جنہیں مذہبی شدت پسندوں نے ہلاک کیا۔

ماحول کی تبدیلی سے بقا کو خطرہ

محلِ وقوع، گنجان آبادی اور افلاس کے ہاتھوں بنگلا دیش کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے، جو ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی زد میں سے زیادہ ہیں۔ بنگلا دیش کئی دریاؤں کی گزرگاہ ہے اور یہ دریا بنگلہ سے ہوتے ہوئے خلیج بنگال میں جا گرتے ہیں۔ ان دریاؤں میں گنگا اور برہم پتر نمایاں ہیں۔ مجموعی رقبے کا بڑا حصہ ڈیلٹا پر مشتمل ہونے کے باعث بنگلا دیش میں کم وبیش ۸۰ فیصد رقبہ کسی نہ کسی حد تک سیلاب کی زد میں رہتا ہے۔ جنوب مشرقی بنگلا دیش میں تقریباً ہر چیز سیلاب کی زد میں ہے۔

دنیا بھر میں سمندروں کی سطح بلند ہوتی جا رہی ہے۔ بلند ہوتی ہوئی سمندری سطح زمین کو مزید گھیرے میں لے گی۔ بنگلا دیش اس حوالے سے شدید خطرے کی زد میں ہے۔ اس کے بہت سے علاقے پہلے کے مقابلے میں اب واضح طور پر سمندری پانی کی آماج گاہ بن چکے ہیں۔ بنگلا دیش مجموعی طور پر میدانی علاقہ ہے جس میں بلند علاقے کم کم ہیں۔ ملک بھر میں علاقوں کی (سمندر کی سطح سے) اوسط بلندی ۱۰ میٹر سے زائد نہیں۔ سمندر کی سطح میں ایک میٹر کی بلندی کے بعد بنگلا دیش کا کم وبیش ۱۵ فیصد رقبہ (جو کم وبیش ۳ کروڑ افراد کا مسکن ہے) زیرِ آب ہوگا۔ مسلسل سیلاب کی زد میں رہنے

سے آبادی کے حوالے سے آٹھویں بڑے اور فی مربع کلومیٹر آبادی کے حوالے سے دسویں بڑے ملک کے کروڑوں افراد ملک کے اندر ہی بے گھری کے مسئلے سے دوچار رہیں گے۔

ایک بڑا مسئلہ سیم کا ہے۔ سمندری پانی وسیع رقبے پر پھیل کر زمین کو ناکارہ بنا رہا ہے۔ زمین کی زرخیزی بھی گھٹتی جا رہی ہے اور زیر زمین میٹھے پانی کے ذخائر بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ بنگلا دیشی بنیادی طور پر زرعی ملک ہے، اس لیے سمندری پانی کے ہاتھوں زمین کی زرخیزی کا گھٹنا یا اس کا بالکل ناکارہ ہو جانا انتہائی خطرناک ہے۔ پینے کے صاف پانی کا حصول بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

موسم میں رونما ہونے والی غیر معمولی تبدیلیاں بھی بنگلا دیش میں قحط کو راہ دے سکتی ہیں۔ شدید گرم موسم فصلوں کو خراب کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ زمین کی زرخیزی کا گراف بھی گر سکتا ہے۔ تبت میں چین کی جانب سے تعمیر کیا جانے والا ڈیم بھی بنگلا دیشی دریاؤں میں پانی کی مقدار کے گھٹنے کا سبب بن رہا ہے۔

"Bangladesh: Still not on the Global Radar".
("The Globalist". September 11, 2016)

●●●

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی چند مفید کتابیں

زندگی کے عام فقہی مسائل
(جلد اول تا سوم)
ڈاکٹر مفتی ابو اسامہ مدنی

عیسائیت، حقائق و واقعات
رضی الدین سید

مندرجہ موضوعات پر فکر انگیز لیکچرز پر مشتمل آڈیو سی ڈیز
- شیطان ہمارا دشمن کیوں؟
- امت کے لیے راہ نجات
- آج کے مسائل کا حل اسلام ہی کیوں؟
- استحکام خاندان
- امت مسلمہ، آج اور کل
- اصلاح معاشرہ

ملنے کا پتہ: ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی

دہشت گرد کی پہچان

Simon Hattenstone

پہلی بات یہ ہے کہ آڈیشن (اداکاری یا گلوکاری کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے دی جانے والی مختصر پرفارمنس) نے مجھے ہوائی اڈے سے آسانی سے نکل جانے کے قابل بنایا، تاہم بعد میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ میں ایک اداکار ہوں۔ اپنے لڑکپن سے ہی میں مختلف کردار ادا کرتا رہا تھا۔ اس دوران مجھے اپنی پاکستانی فیملی کی ثقافتی توقعات کا بھرم، ایک ایشیائی نژاد برطانوی لڑکے کا دوٹوک کلچر اور ایک نجی اسکول میں اسکالرشپ پر تعلیم حاصل کرنے کے جواز جیسے مسائل سے بھی نمٹنا تھا۔ میری ذاتی شناخت کا الجھا ہوا پہلو، جس پر ایشیائی ہونے کی چھاپ زیادہ گہری تھی، کسی بھی روشن دن میرے لیے مسائل بڑھا سکتا تھا، اور ایسا بارہا ہوا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے دیگر بچوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہوئے ایک دن مجھے اور میرے بھائی کو ایک نوجوان نے روکا اور میرے بھائی کے گلے پر چاقو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اُن کے نزدیک سیاہ فام تھے۔ اس کے ایک عشرہ بعد میرے گلے پر بھی چاقو رکھا گیا۔ یہ چاقو ایک ''پاکی'' (پاکستانیوں کو مغرب میں طنزاً اس نام سے پکارا جاتا تھا) کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہم اسی لیبل سے پکارے جاتے تھے۔ اگلی مرتبہ میں نے خود کو انتہائی لاچار پایا' جب میں لوٹن ایئرپورٹ کے ایک بند کمرے میں تھا اور میرے بازو پر تکلیف دہ حد تک آرم لاک لگا ہوا تھا جبکہ دیگر برطانوی انٹیلی جنس افسران نے میری گردن کو موڑتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ یہ نائن الیون کے بعد کی بات ہے۔ میں مسلمان تھا۔

اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے ہوئے آپ غصہ دکھانے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آپ کی جدوجہد کا تمام اثاثہ گروی رکھا ہوتا ہے۔ آپ کا ذاتی کوہ نور ہیرا کسی اور کے تاج میں جڑا آپ کا منہ چڑاتا ہے۔ اس کے عوض آپ کو ایک علامتی نیکلس دے دیا جاتا ہے جس میں آپ کے انتخاب کو دخل نہیں ہوتا، لیکن وہ آپ کو اپنی گردن کے گرد سجانا پڑتا ہے۔ میرے اداکار بننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں شاید اس نیکلس کو قدرے مزید موتیوں سے سجانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایک نوعمر لڑکا، جس کا کوہ نور چھن گیا ہو، کے لیے یہ تصور قدرے طمانیت بخش تھا۔

فلموں میں، میرا کردار ایک ایسے لڑکے کا تھا جو دیگر سیاروں کی عجیب الخلقت مخلوق کو انسان بنا سکتا تھا۔ شاید اس میں امید کا ایک پہلو نکلتا تھا، تاہم مجھے احساس تھا کہ اقلیتیں مرحلہ وار ہی آگے بڑھ کر اپنا مقام بنا سکتی ہیں، چنانچہ میں ایک طویل سفر کے لیے تیار تھا۔ اس سفر کے بہت سے مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ دو جہتیں رکھتا ہے۔ منی کیب کا ڈرائیور یا دہشت گرد یا کسی دکان کا مالک۔ یہاں آ کر نیکلس قدرے تنگ ہو جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ مسخ شدہ کردار نگاری کا تھا۔ اس کا انتخاب بھی ''نسل پرستی'' ہی تھا لیکن یہ موجودہ جامد تصورات کو چیلنج کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سے نیکلس قدرے ڈھیلا ہو گیا۔ تیسرا مرحلہ اُس آفاقی سرزمین پر قدم رکھنا تھا جہاں آپ ایسا کردار ادا کرتے ہیں جس کی کہانی اس کی اپنی نسل سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس کہانی میں مجھ پر دہشت گردی کا شک نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ہی کسی پر جبری طور پر شادی کا معاہدہ مسلط کیا جا سکتا تھا۔ اس کہانی میں میرا نام ڈیوڈ بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں نیکلس موجود نہیں، اور نہ ہی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے نائن الیون کے بعد کی ہنگامہ خیز دنیا میں پہلے مرحلے میں قدم رکھا۔ یہ ایک جامد کردار تھا۔ فرض کریں کسی ٹیکسی والے یا دکاندار کا، لیکن چونکہ میں صرف اٹھارہ سال کا تھا، اس لیے میں نے اس جامد دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خوش قسمتی سے دوسرے مرحلے میں قدم رکھنے کا تھوڑا سا موقع مل گیا، اور میں نے حقیقی کرداروں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے فرضی کرداروں کی دنیا میں چھلانگ لگا دی۔ میری پہلی فلم مائیکل ونٹر بوٹم کی ''The Road to Guantánamo'' تھی۔ یہ فلم برمنگھم سے تعلق رکھنے والے دوستوں کے ایک گروہ کی کہانی سناتی ہے جنہیں امریکا کے حراستی کیمپ میں غیر قانونی طور پر رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جب اس فلم کو برلن فلم فیسٹیول میں ایوارڈ ملا تو ہم خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی، اُنھوں نے اورنج جمپ سوٹ پہننے شروع کر دیے، تاہم ایئرپورٹ سکیورٹی کو ہمارے بارے میں علم نہ تھا۔ جب ہم فلم فیسٹیول میں کامیابی کے بعد، خوشی سے سرشار لوٹن ایئرپورٹ پر پہنچے تو ستم ظریفی یہ ہوئی کہ برطانوی انٹیلی جنس افسران مجھ پر پل پڑے۔ ایک نے میرے بازو پر اتنی شدت سے آرم لاک لگایا کہ لگا جیسے میرا بازو اکھڑ جائے گا۔ دوسروں نے مجھے

دھمکیاں دیں اور پھر مجھ پر حملہ کر دیا۔ ایک نے میری گردن دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے دھاڑ کر کہا..... ''کس قسم کی فلمیں بناتے ہو تم؟ کیا تم مسلمانوں کی مہم کو آگے بڑھانے کے لیے اداکار بنے ہو؟'' ساتھ ہی میرا بازو اور گردن مزید مروڑ دی گئی۔

یہ سوال پریشان کن ہے، کیونکہ یہ نہ صرف فنکارانہ اظہار کو خطرے میں ڈال دیتا ہے بلکہ اس سے یہ فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے کہ ہمارا سکیورٹی اپریٹس دہشت گردی کے حقیقی خطرے کی تفہیم کے قابل نہیں۔ بعد میں اسپیشل برانچ کے افسران کو پتا چلا کہ اُن کا اقدام غیر قانونی تھا۔ مجھ سے وکلا کے نمائندوں نے پوچھا کہ کیا میں قانونی کارروائی کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کی بجائے میں نے اس واقعے کا حال لکھا اور چند ایک صحافیوں کو بھیج دیا۔ فلم کے اداکاروں کو دہشت گرد سمجھ کر غیر قانونی حراست میں رکھنے کا واقعہ ایسا نہ تھا کہ صحافی بھائی اسے نظر انداز کرتے۔ میں خوش تھا کہ میری وجہ سے ایسے معاملات منظر عام پر آ گئے ہیں۔ میں نے اس واقعے سے متاثر ہو کر ایک گانا لکھا، جس کا عنوان تھا: ''Post 9/11 Blues''۔ اس میں نصیحت تھی، جیسا کہ..... ''ہم سب مشکوک ہیں، چنانچہ ہم سے منہ موڑ لو۔ دھواں چھوڑنے پر مجھے کیمیکل حملے کے الزام میں گرفتار کرو''۔ اس گیت نے کرس مورس (Chris Morris) کی توجہ حاصل کر لی اور اُس نے مجھے ''Four Lions'' میں کاسٹ کر لیا۔ آخر میں میرا بازو اُس وقت پھر اکھڑنے کے قریب تھا جب لوگ اسٹیج پر دیوانہ وار مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ اب تک ٹیکلس بہت ڈھیلا ہو چکا تھا، لیکن ٹھہریں، تیسرے مرحلے کی آفاقی سرزمین کہاں گئی؟

ایسا لگتا تھا' جیسے کسی برطانوی اداکار کے سامنے ایسا کوئی راستہ نہیں ہے جس پر چل کر وہ اس تیسرے مرحلے میں داخل ہو سکے۔ تمام پروڈیوسر کہتے کہ وہ میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن اُن کے پاس ایسا کوئی مناسب کردار نہیں ہے جو میں ادا کر سکوں۔ جو کہانیاں ۲۰۰۰ء کے وسط میں کثیر ثقافتی ادغام کے پس منظر میں بیان کی جاتی تھیں، وہ وہی تھیں جو ۱۷۰۰ء کی دہائی میں لکھی جا چکی تھیں۔ میں نے یہ افواہیں بھی سنیں کہ اداکاری کی وہ ''آفاقی دنیا'' برطانیہ نہیں، ہالی ووڈ کے لیے ہے۔ اس کی وجہ سادہ ہے۔ امریکا اپنی کہانیاں استعمال کرتے ہوئے اپنا دیومالائی امیج آگے بڑھاتا ہے۔ برطانیہ کے بارے میں حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک کثیر ثقافتی ملک ہے، لیکن اس کے بارے میں پھیلنے یا پھیلائی جانے والی کہانی یہ کہتی ہے کہ یہ صرف سفید فام لارڈز یا لیڈیز کا ملک ہے۔ اس کے برعکس، امریکی معاشرہ انتہائی بٹا ہوا ہے، لیکن اس کے بارے میں کہانی یہ سنائی جاتی ہے کہ یہاں آ کر تمام نسلوں، مذہبوں اور ثقافتوں کے لوگ یک جان ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی مجرموں پر نظر رکھتا ہے، سب کے سب اکٹھے ہو کر دہشت گردوں کے خلاف لڑتے ہیں؛ چنانچہ میں نے امریکا کی طرف رخت سفر باندھا، اور یہ کوئی آسان سفر نہ تھا۔

آپ شاید جانتے ہوں گے کہ آڈیشن روم میں ہونے والی غلطیاں یا مہارت، اور ایئرپورٹ کے بند کمرے میں کی گئی پُرتشدد تفتیش میں کوئی فرق نہیں۔ ایسے بہت سے مقامات ہوتے ہیں جہاں آپ کو واقعی مسترد کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ خطرہ محض افسانوی نہیں ہوتا۔ ایسی بھی جگہیں ہوتی ہیں جہاں آپ کے چہرے کے بال بھی آپ کی مارکیٹ کی قدر تباہ، بلکہ آپ کو انتہائی خطرے سے دوچار کر سکتے ہیں۔ خبردار، آپ ایک عام شخص ہیں، ڈیوڈ نہیں۔ یہاں نائن الیون کے بعد ایک مرتبہ پھر ٹیکلس آپ کے گلے میں تنگ ہو جاتا ہے۔ میں نے اب تک آڈیشن کے کمرے میں اس صورت حال سے اپنا بچاؤ کیا تھا، لیکن اب میں امریکی ایئرپورٹس پر تھا۔ یہاں بنائی گئی فلم ''The Road to Guantánamo'' نے میرے لیے رکاوٹ کھڑی کر دی کیونکہ اس کی شوٹنگ کے لیے ہم بیرونی دنیا میں گئے تھے اور میرے پاسپورٹ پر ''Axis of Evil'' ریاستوں کے علاوہ پاکستان کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے چھ ماہ کے قلیل وقفے میں ایران اور افغانستان کا سفر بھی کیا تھا۔ اب میں امریکی ایئرپورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میرا کیا حشر ہو گا۔ جب میں اترا تو ایک افسر نے میری جلد کی رنگت سے ہی مجھے پہچان لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ صاحب کیوبا کی سرحد پر بھی فرائض سرانجام دے چکے تھے۔ اُس نے ایک نظر میرے پاسپورٹ پر ڈالی، دوسری مجھ پر، چہرے کے تاثرات بدل گئے، اور میرے امیگریشن کارڈ پر ایک بڑا سا ''P'' لکھ دیا۔ میں نے فوراً نے سوچا کہ اس نے ''Paki'' کی نشاندہی کی ہے، لیکن اُس نے جیسے میری سوچ پڑھ لی، مجھے بتایا کہ یہ ''پروٹوکول'' ہے۔

اس کے بعد مجھے ایک طویل راہداری سے لے جایا گیا۔ راستے میں کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اور جب مجھے ایک سائیڈ روم میں لے جایا گیا تو یہ میرا جانا پہچانا تھا۔ ایک چینی خاندان اور ایک جنوبی امریکا کے پائلٹ کے علاوہ باقی تمام افراد کی شباہت مجھ جیسی تھی اور اُن سب کے ہاتھ میں قلم تھے اور وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ جب میں اندر داخل ہوا تو وہ سب کے سب ایک ساتھ مجھے گھورنے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بالی ووڈ میں Being John Malkovich کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ یہ منظر احساس دلاتا تھا کہ تم لوگ ایک ''ٹائپ'' ہو، اور آپ کا منہ کھلنے سے پہلے آپ کا چہرہ بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔ آپ ایک فرد ہونے سے پہلے ایک ''اہمیت'' رکھتے ہو، آپ اس اسٹیج پر پردہ کے پیچھے ہو۔ اس خوف سے لبریز کمرے میں ہاتھ میں قلم پکڑنا بھی آڈیشن دینے سے کم نہیں تھا۔ ہر کوئی نروس تھا، لیکن یہ پریشانی ہمارے درمیان اتفاق اور یگانگت پیدا نہیں کر رہی تھی کیونکہ معاملہ مسابقت کا تھا۔ اس صورت حال میں آپ اپنی شخصیت کو پہچان رہے ہوتے ہیں یا اس کی پہچان کرا رہے ہوتے ہیں۔ ایک حوالے سے آپ یہ کہتے ہیں..... ''میں ان جیسا نہیں ہوں''۔

جب ایئرپورٹ پر تفتیش کی گئی تو یہ میرا ''سلم ڈاگ میلینز'' کا آڈیشن نہیں، کسی کار کا ایکسیڈنٹ لگتا تھا۔ تروتازہ چہرے والا ڈیسک آفیسر شاید ۲۳ برس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ جب اُس نے مجھے 'آڈیشن' کے لیے طلب کیا تو اپنے پاسپورٹ پر لگی مہروں کی وضاحت کرنے کے لیے میری تقریر تیار ہو چکی تھی۔ میں نے اُسے فلم پروڈیوسر کی طرف سے وصول ہونے والا خط دکھایا۔ فوراً ہی دوسرا داؤ کھیلتے ہوئے ایک نئی، چمکدار ڈی وی ڈی لہرائی اور کہا: ''ایوارڈ یافتہ فلم''، لیکن خدا آپ کا بھلا کرے، مجھ سے تفتیش کرنے والا نوجوان مجھ سے بھی زیادہ نروس ہو چکا تھا۔ غالباً وہ "Beware Bloodthirsty Actors" سیمینار میں شرکت کر چکا تھا۔ حکم ملا: ''کاؤنٹر سے دور کھڑے ہو''۔ میں اچھلا اور اُس قطار میں شامل ہو گیا جس کی تفتیش ایک مزید خطرناک دکھائی دینے والا تندومند شخص کر رہا تھا۔ اُس کی مونچھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں انتظار کرتے ہوئے اُس کے سامنے بولی جانے والی لائنوں کی ریہرسل کرنے لگا۔ جب میری تفتیش کی باری آئی تو ایسے لگا جیسے میرا کسی تیز رفتار کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ یہ کسی فلم کے لیے آڈیشن دینے کا معاملہ نہیں تھا۔ پاسپورٹ پر لگی مہروں پر نظر ڈالتے ہی وہ دھاڑا:

''اوئے افغانستان؟ کس قسم کی فلم بناتے رہے ہو تم وہاں؟''

یہ وہی سوال تھا جو مجھ سے لوٹن ایئرپورٹ پر پوچھا گیا، جب میرے بازو پر آرم لاک لگا ہوا تھا اور میری گردن دیوار کے ساتھ خطرناک زاویے سے مڑی ہوئی تھی۔ اس دوران میں خود سے بھی ایک سوال کر رہا تھا کہ کیا میں تیسرے مرحلے کی طرف بڑھ رہا ہوں یا دوسرے یا پہلے کی طرف؟ ٹیکلس ڈھیلا ہو رہا ہے یا مزید تنگ؟ میں نے اُن نازک لمحات میں جلدی

سے درست جواب سوچنے کی کوشش کی۔ ''The Road to Guantánamo'' ڈاکومنٹری ڈراما تھا، لیکن اگر میں کہتا کہ میں نے Guantánamo Bay پر ڈاکومنٹری بنائی تھی تو وہ کچھ اور سمجھ لیتا؛ چنانچہ میں نے اُسے سمجھایا کہ ''The Road to Guantánamo'' ایک ایوارڈ یافتہ ڈراما تھا۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ اور اس دوران میرے دل کی دھڑکن برہم۔ پھر اس کی پیشانی پر فکر انگیز لکیر گہری ہونے لگی، تو میں نے اُس کے سامنے وہی نئی اور چمکدار ڈی وی ڈی لہرائی۔ اس پر میری تصویر بھی تھی اور میں نے اورنج جمپ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اورنج سوٹ پر نظر پڑتے ہی میں خود ہی پچھتانے لگا کہ اسے سامنے کیوں کیا۔ اُس نے خاموشی کا مزید طویل وقفہ لیا۔ ایک مرتبہ پھر پیشانی پر سلوٹیں گہری ہونے لگیں۔ اب میرے پاس سامنے لہرانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ پھر وہ گویا ہوا: ''کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو امریکا کو نقصان پہنچانے پر تلا ہوا ہے؟'' میں نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور Hugh Grant کی طرح آوازیں نکالتے ہوئے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ اُس نے کچھ ثانیے میری پرفارمنس پر غور کیا اور پھر میرے سامان سے ایک کتاب برآمد کی۔ یہ محسن حمید کا ناول تھا ''The Reluctant Fundamentalist'' پوچھا یہ کتاب کیا ہے؟ میں نے وضاحت کی لیکن وہ میری بات نہیں سن رہا تھا، بس سوچے جا رہا تھا۔ پھر اُس نے ایک جدید ڈیوائس نکالی اور میرا نام لکھ کر گوگل کیا اور اس پر میرے بارے میں پہلی خبر میرے ساتھ ہوسٹن ایئرپورٹ پر کیا جانے والا سلوک تھا۔ اُس کی مہارت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ یہاں میرا سفر ختم ہوا، اب ہالی ووڈ کو بھول جاؤں اور جان بچانے کی کوشش کروں۔ اب تک تمام اداکاری ہوا ہو چکی تھی۔

تاہم اس کے بعد تین گھنٹے تک سوالات کے تکلیف دہ مرحلے سے گزرا اور وہاں اداکاری ہرگز کام نہ آئی۔ بہرحال ہر مرحلہ گزرنے کے بعد میں پرسکون ہونے لگا۔ جب میں وہاں سے واپس آنے لگا تو میرا گزر پھر اُنہی افراد سے ہوا جن کی شکل اور جلد کی رنگت مجھ سے ملتی تھی۔ میں نے اونچی آواز میں ''السلام وعلیکم'' کہا لیکن کسی ایک نے بھی اس کا جواب نہ دیا۔ غالباً وہ اردو میں یہ اسلامی جملہ منہ سے نہ نکالنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے۔ شاید وہ 'اوگاڈ' یا 'اوگوش' کہنا زیادہ بہتر سمجھتے۔ بہرحال میں مین ہٹن میں اپنے دوست سے ڈنر پر ملا اور تین گھنٹے لیٹ آنے پر معذرت کی، جو اُس نے قبول بھی کر لی۔ ڈنر کے دیگر شرکا ایک دوسرے سے اپنا ستاروں کا علم شیئر کرتے رہے۔ اچانک ایک محترمہ مجھ سے مخاطب ہوئیں اور کہا: ''تم ٹیررسٹ ہو''۔

میرا رنگ اُڑ گیا، یہ کیا مصیبت تھی، کیا میں ایک مرتبہ پھر کسی ایئرپورٹ پر زیرِ تفتیش تھا۔ میں نے پوچھا: ''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' تو میرے دوست نے اُس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر میرے ہاتھ پر رکھ کر دبایا اور کہا... 'رض'۔ اس نے پوچھا کہ کیا تم Sagittarius ہو؟ میں نے بمشکل تھوک نگلا۔ بہت سے چہرے پُرتشویش نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے خود ہی معذرت کی کہ میں اُس کی بات غلط سمجھا تھا۔ لیکن میں غلطی پر تھا۔ یہی بات دوبارہ بھی ہوئی۔ ایک دو مرتبہ نہیں کئی بار اور میرا رویہ بھی جارحانہ ہوتا گیا۔ ایک افسر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے کہیں سے فوجی تربیت حاصل کی ہے۔ میں نے اپنے برطانوی اسکول میں کیڈٹ فورس پروگرام میں شرکت کی تھی؛ چنانچہ میں نے ایک لفظ میں جواب دیا ''ہاں'' اور اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں نے عراق، ایران یا افغانستان کا سفر کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ عراق تو نہیں البتہ سعودی عرب اور پاکستان ضرور گیا ہوں۔

اب تک مجھے افسران کی بچگانہ حماقتوں کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ یہ حماقتیں بلکہ مزید حماقتیں جاری رہیں۔ دوسری مرتبہ امریکا میں کام کرنے کے لیے ویزے کی درخواست دینے پر مجھے سیکشن 221-G کے مراحل سے گزرنا تھا۔ یہ ایک طویل بیک گراؤنڈ چیک تھا کہ کہیں میرا تعلق زندگی میں کسی مرحلے پر دہشت گردوں سے تو نہیں رہا۔ اُنھوں نے میرے اٹارنی کو ای میل کی: ''ہائے بل، تمہارا کلائنٹ، مسٹر احمد ہمارے پاس ہے، برطانوی لہجے میں انگلش بولتا ہے، ہم نے اُس کا Post 9/11 Blues گانا بھی دیکھا ہے، لیکن کیا اُس کی لائن ''Iheart Osama'' اُس کے عمل میں تو شامل نہیں؟'' جواب ملا ''ٹھیک ہے، تم اُس کی تلاشی لے لو۔ اُس کے پاسپورٹ پر لگی مہروں کو چیک کرو اور پھر اُس کے احمقانہ حد تک خطرناک گانے بھی سنو''۔

بہرحال امریکا میں ایک ماہ گزارنے کے بعد میری ایئرپورٹ آڈیشن کی کارکردگی میں نکھار آنے لگا اور یہ ایک اداکار کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ مجھ میں دہشت گرد تلاش کیا جا رہا تھا۔ ایک اداکار کو اور کیا چاہیے؟ وہ میرے اندر کسی کو تلاش کر رہے تھے، اداکاری اور کیا ہوتی ہے؟ ایک کردار کے اندر ایک اور کردار۔ اب میں ایک ماہر اداکار کی طرح ایک کردار کی خود پر لگی ہوئی چھاپ کو توڑنے کی کوشش میں تھا۔ میں ایک مشتبہ شخص تھا اور مخصوص اشیائے خورونوش سے پرہیز بھی مجھے مشکوک بناتا تھا۔ میں نے کہانیوں کی دنیا کا ''پروٹوکول'' بھی استعمال نہ کیا۔ کیا میں جدوجہد کے پہلے مرحلے پر تھا؟ بات یہ ہے کہ جب آپ اپنا ماحول تبدیل کر چکے ہوں اور اُس کے گلے میں ڈالا جانے والا نیکلس دوسروں کا ہو تو پھر شناخت کے مرحلے آسان نہیں ہوتے۔ ریہرسل آپ کے اندر ایک کردار کو پختہ کر دیتی ہے، لیکن بعض اوقات جب آپ بہت زیادہ ریہرسل کرتے ہیں تو آپ کے فن کی تازگی ختم ہونے لگتی ہے۔ آپ کردار کے ڈائیلاگ بھولنے لگتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ میں بعد میں ہونے والی آڈیشنز میں ناکام ہونے لگا۔

ایک مرحلے پر یہ آگاہی وارد ہوئی کہ یہ تفتیش ایک بلبلے کے اندر دہرایا جانے والا افسانوی ادب ہے اور یہ میری اصلیت کو نہیں جانچ سکتا۔ آج میں اُس طریقِ کار کو یہی سمجھتا ہوں۔ آخرکار مجھے امریکا میں کام کرنے کا ویزہ مل گیا۔ اب مجھے پروٹوکول سے گزرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اب میرا تیسرے مرحلے کی اُس آفاقی دنیا کی طرف سفر شروع ہونے والا تھا جس کی تلاش میں، میں یہاں آیا تھا۔ اب میں آڈیشنز دیتے ہوئے ایئرپورٹس پر رائٹ سائیڈ پر کھڑا ہوتا، لیکن یہ کوئی کامیابی نہ تھی۔ اگرچہ امریکی ایئرپورٹس پر میرے لیے آسانی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے روک لیا جاتا۔ خاص طور پر ہیتھرو ایئرپورٹ پر تو ہر مرتبہ روکا جاتا۔ تاہم اب میں اس تفتیش سے تکلیف اٹھانے کی بجائے اس کا مزہ لینے لگا تھا۔ ہیتھرو ایئرپورٹ کا اسٹاف اس کے قریبی علاقوں، ساؤتھ ہال اور ہاؤن سلو سے بھرتی کیا جاتا ہے۔ میں نے وہاں سے لگاتار چھ ماہ تک فلائیٹ لی اور ہر مرتبہ ایک ہی درمیانی عمر کے سکھ نے میری تلاشی لی۔ ہر مرتبہ پورے انہماک اور ''ذمہ داری'' سے۔ آخری مراحل میں، میں نے اُسے انکل کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ مزید چند ایک مراحل کے بعد اُس نے بھی مجھے بیٹا کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ چونکہ میں نے زیادہ فضائی سفر کیا، اس لیے رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ اس دوران میرا فلم کا کام بھی بڑھتا گیا۔ ایک دن میری تلاشی ایک مسلمان بھائی نے بھی لی۔ اس نے بھی مجھ سے پوچھا: ''بھائی کس قسم کی فلمیں تم بناتے ہو؟'' میں اس کی گردن سے لٹکے ہوئے آئی ڈی بیج کی طرف دیکھنے لگا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Riz Ahmed: actor, rapper, ranter".
("The Guardian". April 27, 2013)

●●●

اسلامی تحریکیں، شناخت کا بحران

Quinn Mecham

۲۰۱۱ء کے بعد عرب دنیا میں سیاسی تبدیلیوں نے خطے میں اسلام پسندوں کی سیاست اور اُن کے بیانیے کے خدوخال تشکیل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان تبدیلیوں نے حکمتِ عملی اور سیاسی بیانیے کے میدان میں دور دراز کی اسلامی تحریکوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ درحقیقت یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سے ممالک میں اسلامی تحریکیں بحران کا شکار ہیں۔ یہ عوامی حمایت کی کمی کا بحران نہیں، نہ ہی اہمیت ختم ہونے کا بحران ہے۔ بیشتر اسلامی تحریکیں بڑی حد تک حمایت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ممالک کے مستقبل کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے برعکس یہ سیاسی شناخت کا بحران ہے۔ اس بحران نے اپنے ہی بیانیے پر گرفت رکھنے کی اسلام پسند گروہوں کی اہلیت کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔ اسلام پسندوں کا یہ احساس درست ہے کہ وہ اپنے بیانیے پر گرفت کھو رہے ہیں۔ وہ کون ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے، یہ واضح نہیں۔ اور اس کا سب سے زیادہ نقصان خود انہیں ہوا ہے۔ مرکزی اسلامی تحریک اس وقت شناخت کے بحران میں ہے اور اس کے تباہ کُن اثرات اسلام پسند تحریکوں کی اپنی بنیادی سیاسی حمایت کو متحرک کرنے کی اہلیت پر پڑے ہیں۔ اسلام پسند بیانیے بڑی حد تک ارتجاعی بن چکے ہیں۔ اور یہ تحریکوں کے اپنے اندر اس بات پر گہرے اختلافات کا مظہر ہیں کہ سیاسی فعالیت دوبارہ کیسے حاصل کی جائے۔

گزشتہ پانچ برسوں میں کئی اہم وجوہات نے شناخت کے اس بحران کو مہمیز دی۔

۲۰۱۱ء۔۲۰۱۲ء میں عرب دنیا کے کئی ممالک میں ظاہری سیاسی آزادی نے مصر، تیونس، یمن، بحرین، مراکش اور لیبیا جیسی جگہوں پر اسلامی بیانیہ تبدیل کرنے میں مدد دی۔ ان ممالک میں اسلامی تحریک، حزبِ اختلاف کی ایک اصلاح پسند تحریک کے بجائے حکومت میں کردار رکھنے والی ایک ممکنہ طاقتور سیاسی جماعت بن کر سامنے آئی۔ اس عمل کے دوران اسلامی تحریکیں اپنے آپ کو تنظیمی اور نظریاتی، دونوں لحاظ سے دوبارہ بیان کرنے کے تکلیف دہ عمل سے گزریں۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ سیاست کے نئے اصولوں کے اندر رہ کر کھیلا جاسکے اور با اثر انداز میں حکومت کرنے کے لیے ایک جگہ حاصل کی جائے۔ بعد ازاں ان سیاسی آزادیوں کی بڑے پیمانے پر بندش نے اسلامی تحریکوں کو مجبور کیا کہ وہ از سرِ نو جائزہ لیں۔ وہ اس بات پر غور کریں کہ آیا جو تنظیمی اور نظریاتی تبدیلیاں کی گئیں، وہ حالات کے لحاظ سے مناسب تھیں یا نہیں۔ اس جائزے کے نتیجے میں تحریکوں کے اندر ریاست کے ساتھ سیاسی برتاؤ کے معاملے پر اختلافات ہوگئے۔ شام، لیبیا اور یمن کی خانہ جنگیوں نے بھی تشدد پسند جہادی سیاسی قیادت کے لیے مضبوط مواقع فراہم کیے، جس نے اسلام پسند سیاسی گروہوں کے بیانیوں کو چیلنج کیا اور عمل پذیر سیاسی تبدیلیوں کو مزید بے اعتبار کر دیا۔ آخر کار ان خانہ جنگیوں میں نظریاتی طور پر ملوث مصنوعی سازشی جنگجوؤں کے ذریعے سُنی خلیجی ریاستوں اور ایران کے درمیان علاقائی مخاصمت ایک کھلے تصادم میں بدل گئی، جس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ تقسیم میں شدت آ گئی۔ اس کے بعد ''سب کو ساتھ ملا کر چلنے'' والے اسلامی بیانیوں پر قابو نہ رکھا جاسکا اور تنگ نظری پر مشتمل 'قریبی دشمن' والے بیانیے غالب آ گئے۔

میرا مؤقف یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں حالیہ سیاسی پیش رفت سے جنم لینے والے چار عوامل کے ملاپ نے دنیا بھر میں بیشتر اسلامی تحریکوں کے اندرونی اور عوامی دونوں قسم کے بیانیوں کو زبردست زک پہنچائی ہے۔ اور اسلامی سیاسی تحریکوں کے کمزور پڑنے اور بکھرنے کے عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔ خاص طور پر وہ چار عوامل یہ ہیں: (۱) دوبارہ ابھرتا ہوا استبدادی نظام، (۲) پرتشدد اور ڈرامائی جہاد (Theatrical Jihadism) کا جارحانہ پھیلاؤ، (۳) ریاست کے زیرِ نگرانی فرقہ وارانہ مداخلتیں، (۴) اسلامی تحریکوں کے اندر تنظیمی بحران۔ بیانیے پر گرفت کھو دینے کے نتائج بہت اہم ہیں کیونکہ واضح پیغام کا فقدان اِسلامی سیاسی کرداروں کے درمیان ٹوٹ پھوٹ کو فروغ دیتا اور اِنتہا پسند نظریاتی بیانیوں کو اُبھارتا ہے۔ یہ چیز پھر اُن ممالک کے لیے، جہاں اسلامی تحریکوں کو عوامی حمایت حاصل ہے، مقامی سیاست اور سلامتی کے لیے دور رَس چیلنجز پیدا کرتی ہیں۔ ذیل میں اسلامی تحریکوں کے بیانیوں کو درپیش اِن چاروں چیلنجوں کا باری باری جائزہ لیا گیا ہے۔

۱) دوبارہ ابھرتا ہوا استبدادی نظام

وہ ممالک جہاں نئی سیاسی آزادیاں متوقع تھیں یا حاصل ہوگئی تھیں، لیکن بعد ازاں واپس ہوگئیں، اِسلامی تحریکوں نے تیزی سے اور بار بار اپنے سیاسی بیانیوں کو تبدیل کیا۔

بیانیے کی تبدیلی کا سب سے عام نمونہ حکومت یا نظام کی نااہلی، بدعنوانی، اور طبقاتی کشمکش پر تنقید کے غالب بیانیے کو چھوڑ کر ایک تعمیری بیانیے کی تشکیل کا تھا، جو بتاتا تھا کہ بہتری کس طرح آسکتی ہے اور تحریک یہ بہتری کس طرح لائے گی۔ تاہم جب سیاسی حالات یا صلاحیت کی کمی نے تحریک کو مجبور کر دیا کہ وہ عوام سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کی اہلیت نہ رکھنے کو تسلیم کر لیں تو اس نئے تعمیری بیانیے نے بھی اپنی ساکھ کھو دی۔ اس کی وجہ سے لڑائی یا فرار کے ردِعمل نے جنم لیا، جس نے بعد ازاں دوبارہ ابھرتے ہوئے استبدادی نظام کے مقابل اسلام پسند بیانیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ متاثرہ تحریک کا بیانیہ یا تو حکومتی کرداروں کا اَور زیادہ ناقد بن گیا یا پھر اپنی روش میں زیادہ عملیت پسند اور کم نظریاتی ہوگیا۔

مصر میں اخوان المسلمون کا بیانیہ دو انتہاؤں کے درمیان تیزی سے جُھولتا رہا۔ کیونکہ ایک طرف اسے بڑی سیاسی کامیابی ملی اور دوسری طرف سیاسی نظام سے اس کی بے دخلی بھی شدید تھی۔ چنانچہ وہ ''لڑائی'' کے ردِعمل کی نمایاں مثال بن گئی اور حکومت پر مسلسل اور کڑی تنقید کرتی رہی۔ بنگلا دیش کی جماعتِ اسلامی نے بھی اسی طرح بیانیے کو تبدیل کیا۔ حکومت کی طرف سے جماعت پر بڑھتے ہوئے جبر اور نمایاں راہنماؤں کی گرفتاریوں اور پھانسیوں کے بعد جماعت کا بیانیہ تبدیل ہوگیا۔ حکومت میں حصہ داری اور مرکزی سیاسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کے بیانیے کی جگہ سیاسی نظام پر کڑی تنقید نے لے لی۔

دوسری جانب نسبتاً زیادہ عملیت پسند اور کم نظریاتی بیانیے کی طرف تبدیلی کی بہترین مثال تیونس کی النہضہ ہے۔ اس کا بیانیہ حکومت پر تنقید سے تبدیل ہو کر تعمیری سوچ میں بدلا اور پھر جب اس کے سیاسی مواقع دھندلا گئے تو اس نے سیاسی عملیت پسندی کو اپنایا۔ اردن کی جبہۃ العمل الاسلامی نے بھی حالیہ سالوں میں کم و بیش یہی روش اپنائی۔ پڑوس یعنی شام میں جاری جنگ کے تناظر میں حکومت پر تنقید اور تعمیری بیانیہ تبدیل ہو کر سیاسی عملیت پسندی کی شکل اختیار کر گیا۔

بیانیوں کے تیزی سے تبدیل ہونے کی ایک وجہ سیاسی نظام میں نئی اسٹریٹجک حیثیت اختیار کرنے کی ضرورت پر

تحریکوں کے اندر تقسیم بھی ہے۔ ان سمتوں سے قطع نظر جوان بیانیوں نے اختیار کی ہیں، دوبارہ ابھرتے ہوئے استبدادی نظام اور اس کے نتیجے میں بیانیے میں عدم استحکام نے اسلامی تحریکوں کے عوامی تاثر کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی وجہ سے ان تحریکوں کے اپنے حلقوں کے اندر اس بارے میں الجھن پیدا ہوئی ہے کہ ان تحریکوں کا اصل مشن کیا ہے۔

۲) پُرتشدد جہادازم

اگرچہ پُرتشدد جہادازم کی عوام کی نظر میں اہمیت ہمیشہ سے اسلامی تحریکوں کے سیاسی موقف کے لیے خطرہ رہی ہے۔ تاہم ۲۰۱۳ء کے بعد سے دنیا بھر میں جہادی سرگرمی میں ہونے والی پیش رفت نے اسلامی تحریکوں کے لیے اپنے بیانیوں پر قائم رہنا بہت زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔ داعش کی طرف سے زمینوں پر قبضے اور خلافت کے قیام کے اعلان کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر لوگوں کو بھرتی کرنے کی زبردست کوششوں اور تشدد کی تھیٹری (Theatrical) مارکیٹنگ نے مرکزی اسلام پسند تحریکوں کو ایسی دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں کی گئی۔ القاعدہ، بوکو حرام اور الشباب کی طرف سے تشدد کے مماثل مظاہروں نے میڈیا اسپیس کو پُرتشدد اسلام پسند پیغامات سے بھر دیا ہے۔

استبدادی حکومتیں اور سیاسی مخالفین عسکریت پسند مذہبی گروہوں کی جانب سے پیش کیے گئے تشدد کے جواز کو سامنے رکھ کر پُرامن اسلام پسند گروہوں کو بدنام کرنے پر کمربستہ رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ تحاریکِ اسلامی مجبور ہو جاتی ہیں کہ اپنے بیانیے کا کافی حصہ اپنے نظریہ کو عسکری گروہوں کے نظریے سے ممتاز کرنے پر صَرف کریں اور سیاسی اغراض کے لیے پھیلائی گئی غلط معلومات کا توڑ کریں۔ اس کے دو بنیادی اثرات جنہوں نے مرکزی اسلام پسندوں کی اپنے بیانیے کو قابو میں رکھنے کی اہلیت کو کمزور کیا یہ ہیں۔

پہلا یہ کہ پُرتشدد حملوں کی مذمت کرنے میں بیانیے کی جو توانائی خرچ ہوتی ہے، وہ اپنا اصل پیغام مرتب کرنے اور عوام کی نگاہ میں مثبت تاثر قائم کرنے کی کوشش سے توجہ ہٹا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ۲۰۱۵ء میں النہضہ کے عوامی ابلاغ کا بڑا حصہ تیونس اور بیرونِ ملک، دونوں میں پُرتشدد اسلام پسند حملوں کی مذمت پر مشتمل تھا، نہ کہ اپنے نظریاتی اثاثے کے بیان پر۔ یہی کہانی سینا میں ہونے والے جہادی حملوں کے تناظر میں مصر کی اخوان المسلمون کی ہے۔ دوسرا یہ کہ پُرتشدد اسلام پسندوں کے مقابلے میں اپنے بیانیے پر گرفت رکھنے کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے تحاریکِ اسلامی خود بخود اسلام پسندوں کی ایک فرضی قسم اختیار کر گئے ہیں۔ (یعنی تشدد پسند اور غیر تشدد پسند، دونوں کو اسلام پسند گردان کر ایک ہی شمار کیا گیا)۔ دوسرے ممکنہ نام اُن کے لیے نہیں استعمال کیے گئے جیسے مخالف سیاسی جماعتیں، غیر متشدد سرگرم کارکن وغیرہ۔ اس فرضی قسم کو مفاد پرست حکومتوں نے تقویت دی جو اکثر اوقات تشدد پسند اور غیر تشدد پسند اسلام پسندوں کے بارے میں ایک ہی سانس میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔

۳) فرقہ وارانہ موڑ

شام کی خانہ جنگی نے، جو ۲۰۱۱ء میں شروع ہوئی، پُرتشدد جہادازم کو ایندھن فراہم کرنے کے علاوہ اسلام پسندوں کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ یہ جنگ، عرب دنیا میں نظریاتی مفادات کی ایک وسیع پراکسی جنگ میں بدل گئی ہے۔ جس نے سُنی اور شیعہ اسلام پسندوں کے بیانیوں کے درمیان تصادم کو بڑھا دیا ہے۔ سُنی اسلام پسندوں کو عرب خلیجی ریاستوں کی طرف سے اور شیعوں کو ایران کی جانب سے سیاسی اور معاشی غذا فراہم کی جاتی ہے۔ اگرچہ سیاسی اسلام کے بارے میں سُنی اور شیعہ تصورات کے درمیان موجود حقیقی خلیج کو پاٹا جا سکتا ہے، لیکن مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ متنازع ماحول میں یہ خلیج مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اس میں مذہبی دلائل سے زیادہ سیاسی دلائل کا ہاتھ ہے، مگر مشرقِ وسطیٰ میں سُنی، شیعہ تصادم کے سیاسی جواز نے اسلام پسند گروہوں کے بہت سے نظریاتی دلائل کو متاثر کیا ہے۔

لبنان اور عراق میں شیعہ اسلام پسند گروہوں نے میدانِ جنگ میں عراق اور شام کے سُنی گروہوں کے خلاف جنگ لڑی ہے اور داعش کا نظریہ قطعی شیعہ مخالف ہے۔ سعودی حکومت کے خیال میں مقامی طور پر اس کا سب سے بڑا چیلنج بغاوت پر آمادہ شیعہ اقلیت ہے۔ اُس نے اِس اقلیت کے خلاف اپنی مہم کو سرکردہ شیعہ راہنما کو اپنی سرزمین پر پھانسی دینے کے درجہ تک پہنچا دیا ہے، جس کے جواب میں بین الاقوامی شیعہ ردِعمل بھی سامنے آیا ہے۔ بحرین میں سُنی بادشاہت نے شیعہ اسلام پسند تحریک الوفاق کے احتجاج کو سنی دنیا کے لیے ایران کی طرف سے کھڑے کیے گئے جغرافیائی سیاسی چیلنج کے طور پر پیش کیا ہے اور یمنی حکومت نے بھی اپنے ملک میں زیدی حوثی بغاوت کے خلاف لڑائی کو اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ پراکسی قوتوں پر اثر و رسوخ قائم رکھ کر سعودی، ایران سرد جنگ نے شام اور یمن کی ریاستوں کی تباہی میں براہِ راست کردار ادا کیا ہے۔ یہ دونوں ناکام ریاستیں اسلامی عسکریت پسندی کا گڑھ رہی ہیں، جس کا اب بڑا حصہ انتہائی فرقہ وارانہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لبنان میں عوامی اور سیاسی تصادم بھی جزوی طور پر فرقہ وارانہ سیاسی پسندیدگیوں کا شاخسانہ ہے۔ اور فرقہ واریت پاکستانی سیاست کو بھی جکڑے ہوئے ہے جس کے نتیجے میں اکثر عام لوگ ہی مرتے ہیں۔

اگرچہ فرقہ واریت کا زیادہ تر اظہار اسلام پسند عسکریت پسندی کے ذریعے ہوتا ہے، لیکن یہ غیر متشدد اسلام پسند تحریکوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ خاص طور پر ان ممالک میں جو مذہبی طور پر تقسیم ہیں۔ جیسے عراق، بحرین اور یمن۔ عراق میں جماعتی سیاست سُنی سیاسی جماعتوں کو کنارے لگانے کی پالیسی کے اثرات سے ابھی تک پوری طرح نہیں نکل پائی، جہاں کمزور سیاسی شمولیت ریاست کی تباہی کا ایک بنیادی محرک ہے۔ اسی کا عکس بحرین میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں بادشاہت شیعوں کی بڑی آبادی کو سیاسی نظام میں شامل کرنے میں ناکام ہوئی اور اسی کی وجہ سے سیاسی نظام مفلوج ہوا۔ یمن میں سنی الاصلاح پارٹی، جو سیاسی تبدیلی کے موقع پر ایک نمایاں حیثیت حاصل کرنے جا رہی تھی، زیدی سیاسی مخالفین کے ساتھ ایک فرقہ وارانہ مقابلے میں پھنس گئی۔ اس نے یمن کی سیاسی تباہی کو آسان کر دیا۔ مفاد پرستانہ فرقہ واریت، جو اَب بہت سی اسلام پسند جماعتوں میں نمایاں ہے، وسیع تر آبادی میں ان کی ساکھ کو نقصان پہنچاتی ہے، انہیں سیاسی تبدیلی کے تعمیری بیانیے کی تشکیل سے روکتی ہے اور اپنی ہی صفوں میں عسکریت پسندی کے خطرے کو بڑھاتی ہے۔

۴) اندرونی خطرات

ان تین بیرونی عوامل کے اثرات نے، جو اوپر زیرِ بحث آئے ہیں، اسلامی تحریکوں کے بیانیوں کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ لیکن اسلامی تحریکوں کے اپنے اندر قیادت کی ناکامی بھی موجود ہے جو اندرونی تقسیم کو اُبھارتی ہے۔ کامیاب اسلامی تحریکیں، جیسے مصر کی اخوان المسلمون، پاکستان کی جماعتِ

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

زندگی کے عام فقہی مسائل

(جلد سوم)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

اسلامی یا الجیریا کی الجبہۃ الاسلامیہ الانقاذ، ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ایک چھتری نما تحریک قائم کرنے میں کامیاب رہیں جس میں ایک متاثر کُن مگر عمومی سیاسی بیانیے کے اندر رہتے ہوئے بہت سے نقطہ ہائے نظر اور سیاسی مفادات سما سکتے ہیں۔ البتہ دباؤ میں ان چھتری نما تحریکوں میں نظریاتی اور حکمتِ عملی کے اختلاف پر تقسیم ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ کیونکہ تحریک کو درپیش مسائل پر ردِ عمل میں ارکان کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس تقسیم کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کے اندر سے مختلف مفادات اور ان کی حمایت کے لیے بیانیے ابھرتے ہیں، جو اصل پیغام پر ڈٹے رہنے کے مسئلے کو بڑھا دیتے ہیں۔

اسلامی تحریکوں کو حکومت کی طرف سے براہِ راست دبانے کی کوششیں، جیسا کہ مصر، بحرین اور بنگلا دیش میں سامنے آئی ہیں، پُر امن اسلامی تحریک کے کارکنان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ آیا انہیں ریاست کے بنائے گئے قوانین پر عمل کرتے رہنا چاہیے، جبکہ وہ قوانین خصوصی طور پر انہیں سیاسی نظام سے بے دخل کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ بعض حمایتی، جماعتی موقف پر ہی قائم رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ حکومت کی اخلاقی کمزوری عیاں ہوگی اور جبر ختم ہوگا۔ بعض ارکان کو اس حکمتِ عملی میں ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ حکومت کی طرف سے ملنے والے اشارے واضح ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ براہِ راست ٹکراؤ کی سیاسی حکمتِ عملی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ بعض دوسری مثالوں میں جہاں سیاسی رکاوٹوں یا غلط سیاسی فیصلوں کے نتائج کی وجہ سے اسلامی تحریکوں کو فعالیت کھونے کا ڈر ہوتا ہے، حکمتِ عملی میں اسی طرح کی تقسیم نظر آتی ہے۔ اسٹیٹس کو، کے حمایتی نرم رَوِش جبکہ بعض دوسرے خطرات کے باوجود زیادہ سرگرم بیانیے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

غیر یقینی صورتِ حال کے بعد استبدادی حکومتوں کا احیا، تشدد پسند جہادازم کا برق رفتار فروغ، اسلام کے اندر ایک جارحانہ فرقہ وارانہ سیاست اور نظریے اور حکمتِ عملی پر اسلامی تحریکوں کے اندرونی اختلافات کے مشترکہ نتیجے کے طور پر اسلامی تحریکوں کی شناخت پر اب ایک سوالیہ نشان ہے۔ اگرچہ سیاسی اسلام میں بیشتر مرکزی کرداروں کی شخصی شناختیں مستحکم ہیں، مجموعی طور پر عرب دنیا اور اس سے باہر بھی اسلامی تحریکوں کی عوامی شناخت تیز رفتار تبدیلی کے عمل میں ہے۔ شناخت کی یہ ڈرامائی اور کثیر جہتی تبدیلی بیشتر مرکزی اسلامی تحریکوں کے لیے اچھی نہیں ہے۔ یہ ان کے اسلامی اخلاقی فریم ورک میں رہتے ہوئے ایک تعمیری معاشرتی تبدیلی کے طویل مدتی سیاسی اہداف کے لیے حقیقی چیلنج کھڑے کرتی ہے۔

اسلامی تحریکوں کے لیے بیانیہ (Narrative) بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ انہیں اپنی سیاسی بنیاد سے جوڑتا ہے، جس کے بغیر وہ اپنے سیاسی اور معاشرتی اہداف حاصل نہیں کر سکتے۔ ہر سیاسی تحریک کی طرح، اسلامی تحریکوں کے لیے بھی ایک 'سیاسی برانڈ' (Political Brand) اور 'تبدیلی کی کہانی' کی احتیاط کے ساتھ تعمیر، سیاسی سرگرمی کے لیے مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اسی لیے سیاسی مہمات میں وسائل کا بڑا حصہ اپنا برانڈ اور کہانی کو تعمیر کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ تاہم اسلامی دنیا کے بڑے حصے، خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ میں مرکزی اسلام پسند جماعتیں اپنے اصل برانڈ پر گرفت کھو چکی ہیں اور ان کے بارے میں کہانیاں اتنی کثرت سے سنائی جاتی ہیں کہ جب وہ خود اپنی کہانی سناتے ہیں تو اس کا بڑا حصہ دوسروں، خاص طور پر حکومتوں، عسکریت پسندوں اور سیاسی مخالفین کی طرف سے ان کے بارے میں سنائی جانے والی غلط کہانیوں کی وضاحت پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہ چیز اسلامی تحریکوں کی مستقبل کی کامیابی کے لیے رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے۔ مستقبل قریب میں اسلامی تحریکوں کے تبدیل ہونے کا امکان نہیں۔ اسلامی تحریکیں کس حد تک اپنے بیانیے پر دوبارہ قابو پانے اور اس سے منطقی طور پر جُڑے سیاسی فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گی، اس کا انحصار بیدار مغز قیادت کے فیصلوں اور زمانہ حال میں موجود بے یقینی کے معاملات پر ٹھوس نظریات قائم کرنے پر ہے، جیسے ''تشدد کے استعمال پر موقف، انسانی حقوق پر رائے، دوسری اسلامی تحریکوں اور فرقوں کے ساتھ تعلقات، معاشرے میں مذہب کا کردار اور ریاست کے اصل کردار کے بارے میں نظریات''۔

اگرچہ ماضی میں تحریکوں کے لیے آسان تھا کہ وہ ان میں سے بعض معاملات پر گومگو کا شکار رہ کر بھی ایک موثر بیانیہ تشکیل دے سکیں، مگر اسلام ازم کی نئی دنیا میں ان معاملات پر مضبوط اور واضح موقف اہمیت کا حامل ہوگا۔ درحقیقت ایک اسلام پسند گروہ، جو حالیہ دنوں میں اپنے بیانیے کے لحاظ سے ان معاملات پر سب سے زیادہ مستقل مزاج رہا ہے، وہ داعش ہے۔ اور یہی گروہ بیانیے کو سمجھانے کے لحاظ سے سب سے زیادہ مؤثر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی تحریکوں کو قطعاً داعش کے برانڈ کی پیروی نہیں کرنی چاہیے، لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ اپنے سیاسی نظاموں میں فعالیت کو قائم یا دوبارہ حاصل کر سکیں تو انہیں اپنے برانڈ کے بارے میں واضح تر اور زیادہ شفاف مؤقف کے ساتھ سامنے آنا ہوگا۔ (طاہرہ فردوس)

"The Islamist identity crisis".
("pomeps.org". February 26, 2016)

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ اسلامک ریسرچ اکیڈمی' کراچی ہر ماہ کی پہلی اور سولہویں تاریخوں کو ''معارف فیچر'' شائع کرتی ہے۔ ''فیچر'' بلا قیمت ارسال کیا جانے والا پندرہ روزہ ہے۔ جب بھی کسی صاحبِ علم یا طالبِ علم کی طرف سے ''معارف فیچر'' جاری کرنے کی خواہش کا اظہار ہم تک پہنچتا ہے' ہم بلا تاخیر پرچہ جاری کر دیتے ہیں۔

۲۔ لیکن جیسا کہ بہت سے قارئین کو علم ہے کہ ایک سال تک پرچہ جاری رکھنے پر ادارہ کو تقریباً = /۵۰۰ روپے کا خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہم بجا طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ پرچہ ملنے کے بعد ہمارے قارئین میں سے جن جن کے لیے ممکن ہوگا' وہ کم از کم اپنے حصہ کی رقم (۵۰۰ روپے سالانہ) از خود اور بلا طلب کسی مناسب ذریعہ سے ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی'' کو بھجوا دیں گے۔ نیز خود ہی اگلے برسوں کے لیے بھی اس طریقے پر عامل رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

۳۔ زرِ تعاون (Contribution) یا عطیہ (Donation) بھیجنا آپ کا خالص رضا کارانہ (Voluntary) عمل ہے۔ ہم اسے نہ لازم کرتے ہیں' نہ طلب کرتے ہیں' نہ پرچہ بھیجنے کی شرط قرار دیتے ہیں اور نہ اس کی عدم وصولی پر ''فیچر'' کی ترسیل منقطع کرتے ہیں۔

ہم آپ کے تعاون' دعاؤں' مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔

نوٹ:۔ زرِ تعاون اور عطیات کے چیک/ڈرافٹ وغیرہ پر

Islamic Research Academy Karachi

لکھیے/لکھوائیے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:

D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201 , 36349840

تبدیلی مگر کہاں اور کیسے؟

منیر احمد خلیلی

تبدیلی کے نعرے زور و شور سے جاری ہیں، مگر نعرے لگانے والوں کی نظر میں صرف حکومت کی تبدیلی مطلوب ہے۔ کوئی یہ طے نہیں کرتا کہ تبدیلی کا اصل محور اور مرکزی نقطہ کون سا ہے اور تبدیلی کیسے آئے اور کون لائے؟ تبدیلی کے نعرہ بازوں کو ان عوامل کی بھی خبر نہیں ہے جو سیاسی، معاشی اور سماجی خرابیوں کو جنم دیتے ہیں۔ ان عوامل پر غور کرنے والے بہت سر مارتے ہیں تو بس اس نتیجے پر پہنچ کر رک جاتے ہیں کہ ہم تعلیمی میدان میں دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔ یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ ان کی نظر میں تعلیمی ترقی ہی تبدیلی کا حقیقی راستہ ہے۔ درست کہ تعلیمی ترقی لازمی ہے لیکن ہمارے مسائل کا بڑا سبب یہ نہیں ہے۔ میں نے جتنا غور کیا مجھے جہالت سے بڑا مسئلہ جاہلیت ہی محسوس ہوا۔ ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو صاف عیاں ہے کہ اس جاہلیت شکار اَن پڑھ لوگوں سے زیادہ جدید ترین تعلیمی اداروں لاہور کے ایچی سن اور گورنمنٹ کالج اور اس سے بھی آگے آکسفورڈ تک کے تعلیم یافتگان جاہلیت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جاہلی معتقدات، توہمات اور فرسودہ رسوم و رواج، خود ساختہ مذہبی تصورات اور اخلاقی پستی کی دلدل میں یہ جدید تعلیم یافتہ لوگ اتنے ہی دھنسے ہوئے ہیں جتنے تعلیم سے محروم غریب اَن پڑھ طبقات۔ قومی زندگی کے سماجی اور سیاسی دائروں پر جاہلیت کے یہی شاہکار اعلیٰ تعلیم یافتہ گروہ قابض ہیں۔

اس جاہلیت کی فضا میں پروان چڑھنے والے جراثیموں نے معاشرے کو طرح طرح کے عوارض میں مبتلا کر رکھا ہے۔ انہی جاہلیت زدہ ہواؤں کے جھونکے اجتماعیت کو چھوتے ہیں تو اسے مسموم کر دیتے ہیں۔ یہیں سے سڑاند اٹھتی ہے اور سارا ماحول متعفن ہو جاتا ہے۔ وہ کرپشن جس کے خلاف آج بہت ہر ایک نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے اس کے زہر آلود چشمے جاہلیت کے ان مراکز سے پھوٹتے ہیں۔ کرپشن محض مالی بددیانتی ہی کا نام نہیں ہے۔ قرآن پاک میں یہ جو 'فساد' کی اصطلاح آئی ہے، کتابِ پاک کے انگریزی ترجمہ نگاروں نے اس کا ترجمہ Corruption ہی کیا ہے۔ انگریزی کی ڈکشنریوں میں لفظ 'کرپشن' کا مطلب کسی چیز کی بنیادی اور حقیقی شکل بدل دینا ہے۔ بے ایمانی، بددیانتی اور غیر قانونی رویہ اور طرزِ عمل بھی کرپشن ہے۔ پاکیزہ چیز کے جوہر کو بدل کر اسے گندا کر دینا کرپشن ہے۔ سقراط کو موت کی سزا دینے کے لیے جس جرم کا مرتکب قرار دیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ نئی نسل کو یونانی معاشرے کی معتدل اقدار اور مروّج روایات کا باغی بنا رہا ہے۔ کہا گیا تھا کہ وہ فکری کرپشن پھیلا رہا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ سقراط اپنے دَور کی جاہلیت سے لڑ رہا تھا۔ وہ جمود اور تعفن کی علامت رسوم و رواج، عقائد و نظریات اور توہمات کے خلاف آواز اٹھا رہا تھا۔ اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے بالادست اور اونچے طبقات عوام کو فاسد اور گمراہ کن سوچ کا اسیر بنا لیتے ہیں، یہ بھی کرپشن کی ایک شکل ہے۔ ہم اس نوعیت کی کرپشن میں سب سے زیادہ جاہلیت زدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں ہی کو دیکھتے ہیں۔

جن کو جمود کی قوتوں نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، تبدیلی کے نعرے ہم انہی کے گلے سے نکلتے دیکھ رہے ہیں۔ تبدیلی قوم کو جاہلیت سے نجات دیے بغیر نہیں آسکتی۔ یہ جس طرح کی تبدیلی کے ہم مطالبے دیکھ رہے ہیں، یہ لگی ہوئی آگ کے ایک چھوٹے شعلے پر پانی کی ننھی سی دھار پھینکنے کا نام ہے۔ اس دھار سے ہولناک الاؤ نہیں بجھ سکتا۔ کرپشن یا فساد اور بگاڑ کی اصلاح کے لیے قوم نے پارلیمنٹ، عدلیہ اور فوج کے اداروں سے توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔ ان اداروں کے اعلیٰ ذمہ دار بھی اسی جدید تعلیم سے آراستہ ہیں، جو جہالت سے تو نجات دیتی ہے مگر جاہلیت کی گرفت مضبوط بناتی ہے، لیکن وہ ذمہ دار اگر جاہلیت سے کچھ محفوظ بھی فرض کر لیے جائیں تو معاملہ یہ ہے کہ ملکی آئین نے ان اداروں کے لیے طاقت کا جو دائرہ مقرر کیا ہے اور اختیار کی جو حدود طے کر رکھی ہیں وہ آگ لگنے کے اسباب سے بحث نہیں کرتیں، آگ بجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ملکی آئین کی ۶۲ دیں اور ۶۳ ویں شق صرف یہ کہتی ہے کہ جو صادق اور امین نہیں ہے، وہ پارلیمان کی رکنیت یا کسی بڑی حکومتی اور سرکاری ذمہ داری سنبھالنے کا اہل نہیں ہے۔ یہ دونوں شقیں اس اخلاقی فساد سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں، کذب اور خیانت جس کی صرف دو شکلیں ہیں۔ اگر سارے کا سارا معاشرہ کاذب اور خائن بن جائے، معاشرے کے تمام لوگ صداقت اور امانت داری ترک کر دیں تو آئین کی روشنی میں یہ ان اداروں کے سربراہوں کی پریشانی کا مسئلہ نہیں ہے۔ آئین کی روشنی میں عدالتیں یا دفاعی ادارے معاشرے کے سدھار میں کردار ادا کرنے کے مکلّف ہیں ہی نہیں۔ کوئی جج یا جرنیل معاشرتی بگاڑ پر ذاتی حیثیت میں ممکن ہے کڑھتا بھی ہو، مگر اس کے منصبی دائرۂ اختیار میں نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر معاشرے کی اصلاح کی کوئی مہم شروع کر دے۔ یہاں تک کہ ان اداروں کے سربراہ بہت نیک اور پارسا ہوں اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان اداروں کے اندر کرپٹ اور سیرت و کردار کے لحاظ سے گھٹیا افراد گھس آئے ہیں تو وہ ازخود کوئی کارروائی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ انہیں بہرحال آئین اور محکمانہ قواعد وضوابط سے مشورہ کرنا اور رہنمائی لینی پڑتی اور کسی سخت تادیبی اقدام کے لیے قانون کی کھڑکی سے جھانک کر اجازت کی چٹ لینی پڑتی ہے۔ جب تک ان کے اداروں میں قواعد و ضوابط کی کوئی کھلی خلاف ورزی سرزد نہ ہو، فوج یا اعلیٰ عدالتوں کے چیف اپنے کسی ماتحت کے محض پست کردار اور گھٹیا سیرت ہونے کی وجہ سے اسے ادارے میں رہنے سے روک نہیں سکتے۔ اہم ترین اور طاقتور قومی اداروں کو قوم کی اصلاح کی ذمہ داری سونپی ہی نہیں گئی ہے۔ سپریم کورٹ کسی معاملے کا نوٹس صرف اس صورت میں لے سکتی ہے، جب کسی ایک فرد یا کچھ افراد کے بنیادی حقوق متاثر ہو رہے ہوں یا صوبوں میں کوئی تنازع پیدا ہو یا کسی مسئلے میں آئین کی تشریح کی ضرورت پیش آئے۔ اور فوج اسی وقت مداخلت کی مجاز ہے، جب امن و امان یا قومی سلامتی کا کوئی سنگین مسئلہ درپیش ہو، تو پھر معاشرے کی اصلاح کا کون ذمہ دار ہے؟ کون پہرا دے کہ کوئی دین و ایمان سے نہ پھرے، شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، کوئی بے حیائی اور فحاشی کا مظاہرہ نہ کرے، کوئی بدعنوانی کا مرتکب نہ ہو، کوئی صداقت اور امانت کی قدروں کو پامال نہ کرے، کوئی بدزبان اور بداعمال نہ ہو، شرافت کے معروف معیار سے گرا ہوا نہ ہو، کسی کے لیے اذیت اور آزار کا موجب نہ بنے، دین و وطن اور قوم و ملت سے بے وفائی کی حرکت نہ کرے؟

یہ بات میں اپنے کئی کالموں میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی ہی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کو دین کی روشنی میں educate کریں۔ لوگوں کی اعتقادی اور اخلاقی تربیت اور خیر و شر، نیک و بد اور جائز و ناجائز کے معاملے میں لوگوں کی رہنمائی کریں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں میں اپنی ذمہ داری کے اس اہم پہلو کا سرے سے شعور ہی نہیں ہے۔ سیاسی جماعتیں نہ صرف یہ کہ سماج کی اخلاقی بنیادوں پر تعمیر اور صالح اقدار کی ترویج کو اپنا کام نہیں سمجھتی ہیں بلکہ ان کے ہر سطح کے لیڈر راستی اور نیکی کا نمونہ کیا بنیں گے، وہ خود بڑی بڑی برائیوں میں ملوث ہیں۔ ان کی گفتگوئیں، تقریریں، میڈیا پر اظہارات سنیں دیکھیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ شائستگی، معقولیت اور شرافت کی ان کو ہوا تک نہیں لگی۔ پچھلے پانچ سالہ اقتدار میں اور موجودہ حکومت کے تین سال میں صرف برسرِ اقتدار جماعتوں ہی نے نہیں بلکہ حزبِ اختلاف نے بھی ثابت کیا ہے کہ اس حمام میں سب یکساں طور پر ننگے ہیں۔ پانامہ لیکس کے کچرے کی طرف انگلی اٹھانے والے اور جن کی طرف انگلی اٹھ رہی ہے، برابر لتھڑے ہوئے ہیں۔ سب کے وجود سے ایک جیسی بدبو اٹھ رہی ہے۔

تبدیلی کے چرچوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کا حالیہ بحران چھاج اور چھلنی کے درمیان کشمکش ہے۔ معاشرے کا نیچے سے اوپر تک ہر طبقہ کرپشن کی کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہے۔ چھاج میں اگر دو چار سوراخ ہیں تو چھلنی میں ہزاروں سوراخ ہیں۔ مگر دونوں ایک دوسرے کو سوراخوں کے طعنے دے رہے ہیں۔ وہ طاقتور قوتیں جو سیاست دانوں کو ان کی بدعنوانیوں پر آنکھیں دکھاتی اور نظام کی بساط لپیٹ دینے کی درپردہ دھمکیوں سے ان کے اعصاب توڑے رکھتی ہیں وہ جس طریقے سے اقتدار چھینتی رہی ہیں، وہ پرلے درجے کی ایک کرپشن تھی۔ وہ عدلیہ کے ادارے جو ان سیاست دانوں کو کبھی سامنے اور کبھی غائبانہ جھاڑ پلاتے ہیں اور ان کی حماقتوں پر انہیں شرمندہ اور خائف بھی رکھتے ہیں، وہی اقتدار پر آئین و قانون اور اخلاقی اصولوں سے ماوراقوتوں کے قبضۂ اقتدار کو سندِ جواز بخشتے رہے ہیں، ان کا یہ عمل بھی کرپشن کی ایک مکروہ صورت تھی۔ جنہوں نے منظّم پارٹیوں میں نقب لگا کر اپنے غیر آئینی چہرے کے لیے سیاسی ماسک تیار کیا تھا یا جو ابھی تک آئینی اور اخلاقی تجاوزات کے مرتکب اپنے ادارے کے سابق سربراہ کو عدالتوں اور آئین و قانون سے بچانے پر بضد ہیں، ان کا یہ عمل بھی کرپشن کی بدترین صورت ہے۔

عمران خان اور بلاول کی شادیوں اور چائے والے کی پرکشش آنکھوں پر گھنٹوں ٹکر چلانے والا میڈیا اور ایک دوسرے سے دست و گریباں سیاسی پارٹیاں، کرپشن کی ان صورتوں پر کوئی جاندار موقف پیش نہیں کرتیں۔ عدلیہ کی اعلیٰ مسندوں پر براجمان مقدس ہستیاں، دفاعی اداروں کے تقدس مآب سربراہ، انتظامی مشینری کے اعلیٰ کارندے، پارلیمنٹ کے ارکان سب عوام ہی سے اٹھتے ہیں۔ عوام کو صالحیت اور پاکیزگی کی تعلیم دینے اور راستِ عملی کی راہ پر ڈالنے والا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے کرپشن کے ایک بہت بڑی برائی ہونے کے احساس کے بغیر وہ کسی نہ کسی طرح کی کرپشن سے داغدار رہتے ہیں۔ عوام کے اندر سے جو قیادت اٹھتی ہے، عوام کے دامن کے داغ اس کے دامن کے دھبے بن جاتے ہیں۔ پھر سیاست کا کھیل سارے کا سارا کرپشن ہی پر کھڑا ہے۔ سیاسی مصلحتیں اور مفادات جو سیاسی اتحاد یا محاذ تشکیل دلاتے ہیں بجائے خود کرپشن کی گھناؤنی قسمیں ہیں۔ الیکشن کے موقعوں پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مقام پر ایک پارٹی دوسری کو گالیاں دے رہی ہوتی ہے اور دوسرے مقام پر اس کے ساتھ اتحاد بنتا اور مفاہمت قائم ہوتی ہے۔ ایک دور میں ایک حکومت کے اتحادی ہوتے ہیں تو دوسرے دور میں پہلی حکومت کی مخالف پارٹی کی حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ منافقت اور موقع پرستی وابن الوقتی اپنی طرز کی ایک کرپشن ہے۔ خیبر پختونخوا کی حکومت کے تین اتحادی ہیں۔ سب ایک دوسرے کے لیڈروں کے کردار و عمل سے خوب واقف ہیں۔ جانتے ہیں کہ اونچی لے میں کرپشن کے خلاف تانیں اٹھانے والی پارٹی کی پہلی صف کے کون کون سے لیڈر ہیں جنہوں نے بنکوں سے کروڑوں کے قرضے معاف کرائے اور کون ہیں جو پراپرٹی کی دنیا کے ڈان ہیں اور کون ہیں جو مشرف دور میں پہلے کرپشن کے کیسوں کی وجہ سے مفرور تھے اور پھر وہ وزارتِ داخلہ کے منصب پر فائز ہوگئے تھے۔ لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے سب میں خوشی خوشی گزارہ ہو رہا ہے۔ یہ 'گزارہ' بھی ایک کرپشن ہے۔

بات پھر وہیں پہنچتی ہے کہ آخر اصلاحِ احوال کسے اور کیسے کرنی ہے؟ خرابیاں عوام میں ہیں اور ان کی چھوت سیاست اور حکمرانی کو لگ جاتی ہے۔ بگاڑ سیاست دانوں اور حکمرانوں میں ہے اور اس کے گندے چھینٹے عوام پر بھی پڑ رہے ہیں۔ جن مخلص اور سنجیدہ دینی قوتوں سے اصلاح کی توقع ہوسکتی تھی وہ بھی سیاست کے گندے تالاب میں اتری ہوئی ہیں۔ وہ عوام کا دینی شعور بیدار کرنے میں ناکام ہیں۔ اجتماعیت کی ایمانی اور اخلاقی حس میں جان نہیں ہے، عوام کی اعتقادی خرابیاں رفع نہیں ہو رہی ہیں، رسوم و رواج کے بندھن ٹوٹ نہیں رہے ہیں اور میڈیا کے ذریعہ پھیلائی جانے والی عریانی وفحاشی کے تابکاری اثرات سے قلوب واذہان اور روحیں محفوظ نہیں ہیں۔ تین چار پرتوں میں بٹا ہوا تعلیمی نظام بالواسطہ طریقے سے زہر معاشرے کے وجود میں داخل کر رہا ہے۔ تبدیلی کے میدان کچھ اور ہیں اور وہ دینی قوتیں اپنی توانائیوں کا ننانوے فیصد کچھ دوسرے میدانوں میں صَرف کر رہی ہیں۔ اس بے حکمتی سے تبدیلی نہیں آسکتی۔ کہیں یہ سمجھ نہیں کہ بگاڑ کہاں ہے اور تبدیلی اور اصلاح کی نہر نکالنے کے لیے یہ فرہاد کن چٹانوں پر تیشہ زنی کر رہے ہیں۔ اس وقت تک تو یہ حیلۂ پرویزی کے شکار ہیں۔

(بحوالہ: ''منیر خلیل بلاگ اسپاٹ ڈاٹ کام''۔ ۸ نومبر ۲۰۱۶ء)

امریکی انتخابات میں ٹرمپ کی جیت

قومی ووٹوں کے اعتبار سے، ٹرمپ ابھی بھی ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھنے والی ہیلری کلنٹن کے مقابلے میں ۲۳۳۰۰۰ ووٹ پیچھے ہیں، یعنی ۵۹٫۹ ملین کے مقابلے میں انہیں ۵۹٫۷ 'پاپولر' ووٹ پڑے۔

چار برس قبل، ڈونلڈ ٹرمپ نے اعلان کیا تھا کہ صدر چننے کے لیے امریکی 'الیکٹرول کالج' کا نظام ''جمہوریت کے لیے تباہ کن'' ہے۔ جب کہ وہ اسی کے طفیل وہائٹ ہاؤس پہنچے ہیں۔

ایسے میں جب ریپبلکن پارٹی کے منتخب صدر نے اس ہفتے کے آخر میں جنوری کے اوائل سے قبل اپنی کابینہ اور انتظامیہ کی تشکیل کے کام کی ابتدا کی ہے، قومی ووٹوں میں وہ ابھی بھی ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھنے والی ہیلری کلنٹن کے مقابلے میں پیچھے ہیں۔

رئیل اسٹیٹ ٹائیکون اور منہ پھٹ کاروباری فرد کو ۲۲۸ کے مقابلے میں ۲۹۰ الیکٹورل ووٹ ملے۔ جبکہ دو ریاستوں میں حتمی نتائج مرتب ہونے والے ہیں۔ حتمی نتائج میں ہوسکتا ہے کہ ٹرمپ کو ۳۰۶ اور ہیلری کو فقط ۲۳۲ الیکٹورل ووٹ ملیں۔

ملک کے پینتالیسویں صدر کے طور پر ٹرمپ کا انتخاب تبدیل نہیں ہوگا، چاہے پاپولر ووٹ میں ہیلری کلنٹن کتنی بھی آگے ہوں، جو امریکا کی سابق وزیر خارجہ ہیں۔ ملک کے بانیوں نے دو صدیاں قبل صدر کے انتخاب کا ایک طریقہ کار وضع کیا، جس کی بنیاد پاپولر ووٹ کی جگہ الیکٹورل ووٹ پر رکھی گئی۔

اپنی اساس کے اعتبار سے امریکی صدارتی انتخابات ملک کی ۵۰ ریاستوں میں سے ہر ایک میں الگ سے لڑے جاتے ہیں، جب جیتنے والے کو ریاست کے تمام الیکٹورل کالج ووٹ پڑتے ہیں۔ انہیں آبادی کی شرح کے لحاظ سے ہر ایک ریاست میں طے کیا جاتا ہے، جس بنا پر زیادہ آبادی والی ریاستوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، آیا کون صدر بنے۔

مثال کے طور پر الیکٹورل کالج میں کیلی فورنیا کے ۵۵ ووٹ ہیں، جب کہ ساتھ چھوٹی ریاستیں اور قومی دارالحکومت جو وفاق کا حصہ نہیں ہے کے محض تین تین ووٹ ہیں۔

(بحوالہ: ''اردو وائس آف امریکا ڈاٹ کام''۔ ۱۲ نومبر ۲۰۱۶ء)

''ٹرمپ'' اور ''بریگزٹ'' نے نظام کو ہلا دیا!

کرس ڈوئل

سال ۲۰۱۶ء نے اکیسویں صدی کی سب سے بڑی ڈرامائی انتخابی مشقیں ملاحظہ کی ہیں۔ بریگزٹ: ریفرنڈم جس میں برطانویوں نے یورپی یونین سے علیحدگی کے حق میں ووٹ دیا اور اب امریکا کے صدارتی انتخابات میں جیت کے بعد ڈونلڈ ٹرمپ کا وائٹ ہاؤس پہنچنا۔

جون ۲۰۱۶ء میں منعقدہ بریگزٹ ووٹ کے مضمرات و عواقب ابھی تک غیر واضح ہیں اور ٹرمپ کی جیت کے جائزے میں برسوں نہیں تو مہینوں ضرور لگیں گے۔ ان دو صورتوں کا اگر زیادہ باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کے مضمرات بڑھتے ہی چلے جائیں گے۔ بہت سے لوگ ان دونوں زلزلوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک کوشش ہی ہے۔

سیاسی ریکٹر اسکیل پر یہ دونوں زلزلے تھے اور ان سے ووٹ ڈالنے والوں کو سبکی ہوئی ہے۔ دونوں ''مزاحمتی'' مہمات ایک حقیقی سیاسی منصوبے کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی ہیں۔ یہ دراصل موجودہ سیاسی آرڈر کا بڑے پیمانے پر استرداد ہے، جہاں مہارت اور حقائق کی کچھ اہمیت نہیں ہوتی ہے اور انھیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ امید کی ایک کرن یہ ہے کہ ان دونوں انتخابات میں نوجوانوں کی بڑی اکثریت نے ووٹ نہیں دیا ہے اور یہ کوئی نوجوانوں کا انقلاب نہیں تھا۔

البتہ قابل تشویش پہلو یہ ہے کہ ان دونوں مہموں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ دونوں قومیں کس قدر منقسم اور بٹی ہوئی ہیں۔ اس معاملے میں یہ دونوں ممالک اکیلے نہیں ہیں۔ آئندہ ماہ آسٹریا کے صدر کے انتخاب کے دوسرے مرحلے کے لیے ووٹ ڈالے جائیں گے اور دائیں بازو کی انتہا پسند جماعت فریڈم پارٹی کے نوربرٹ ہوفر شاید جیت جائیں گے۔ آئندہ سال فرانس کے صدارتی انتخابات میں میرین لی پین کی جیت کے امکان کو کون مسترد کر سکتا ہے؟ یورپ کے جمہوری کلچر کو ایک تاریخی چیلنج درپیش ہوگا۔

دونوں انتخابات میں مضحکہ خیز نعرے لگائے گئے تھے۔ مثلاً ''کنٹرول واپس لیں'' اور ''امریکیوں کو ایک مرتبہ پھر عظیم بنائیں''۔ ٹرمپ نے بذاتِ خود بریگزٹ سے آگے بڑھنے کا غلغلہ بلند کیا اور وہ ''بریگزٹ پلس، پلس، پلس'' کے نعرے بلند کرتے رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں مایوس ووٹروں نے منفی راستے کا انتخاب کیا، موجودہ نظام کو مسترد کیا اور انھوں نے یہ سب کچھ مکمل طور پر ایک غیر واضح راستے کے حق میں کیا۔

طبقہ اشرافیہ بری طرح ناکام ہوا ہے۔ بریگزٹ کے صف اول کے حمایتی بورس جانسن بھی شاید مشکل ہی سے جانتے ہوں گے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ برطانوی حکومت ابھی تک اس سے آگاہ نہیں۔ ٹرمپ کے پالیسی بیانات عام طور پر ایک سو چالیس الفاظ یا اس سے بھی کم پر مشتمل ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ چند ایک اہم عہدوں کے سوا یقین سے کوئی نہیں جانتا کہ صدر ٹرمپ کیا کریں گے۔ بالکل ہماری طرح کوئی نہیں جانتا کہ بریگزٹ برطانیہ کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ ہوگا۔

تعصب، نفرت اور نسل پرستی ان دونوں مہمات اور خاص طور پر ٹرمپ کی مہم میں ایک ایندھن کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اب نسل پرستی ایک انتخابی اثاثہ ٹھہرا ہے۔ برطانیہ میں اگرچہ بریگزٹ مہم نے مہاجرین، تارکین وطن اور مسلم مخالف جذبات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے ٹرمپ کی ریلیوں کی گیرائی اور گہرائی کو سمجھنے کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔

ٹرمپ نے جان بوجھ کر اور کھلے عام منافرت، نسل پرستی اور صنفی فاشسٹ پر مبنی مہم چلائی اور ایسی مہم تو شاید ہی کسی جمہوری قوم نے دیکھی ہوگی۔ اگرچہ وہ اس بات سے آگاہ ہیں اور انھوں نے جیت کے بعد اپنی پہلی تقریر میں بھی اس جانب اشارہ کیا ہے کہ وہ نفرت اور تقسیم کی بنیاد پر افسوس ناک انداز میں انتخابات تو جیت سکتے ہیں لیکن وہ اتفاق رائے اور اتحاد کے ساتھ ہی ملک کا نظم و نسق چلا سکتے ہیں۔

انتہا پسند گُر گے

دنیا بھر میں ہر جگہ دائیں بازو کے انتہا پسند ڈیوڈ ڈیوک سے گیرٹ وائیلڈرز، میجل فراج اور وکٹر اوربن تک ٹرمپ کی جیت پر خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔ اس سے لبرل اقدار اور انسانی حقوق کے دور کا آغاز ہوگا۔ بہت سے لبرلز نے نسل پرستی اور صنفی امتیاز کے خاتمے کے لیے جو تاریخی جدوجہد کی تھی، وہ اب عشروں پیچھے چلی گئی ہے۔

اس سے امریکا، برطانیہ اور جن دوسرے ممالک میں دائیں بازو کے احیا کا تجربہ ہو رہا ہے، ان کے معاشروں میں عدم تفاوت اور تفریق بھی نمایاں ہوگئی ہے۔ ان اختلافات کا باآسانی ازالہ نہیں کیا جا سکے گا۔ ٹرمپ کو منتخب ہونے کے لیے ان اختلافات کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت تھی لیکن اب انھیں ملک چلانے کے لیے ان میں سے بعض کا ازالہ کرنا ہوگا۔

برطانیہ کا یورپی یونین سے انخلا ایک طویل المیعاد فیصلے کا نتیجہ تھا۔ اس کے ذریعے اس نے نہ صرف یورپ بلکہ پوری دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات پر مکمل طور پر نظرثانی کی ہے۔ اس سے برطانیہ بھی بکھر سکتا تھا۔ جن لوگوں نے ٹرمپ کو ووٹ نہیں دیا ہے، ان کے لیے امکان یہ ہے کہ وہ آئندہ چار سال کے دوران انھیں اقتدار سے نکال باہر بھی کر سکتے ہیں۔

تقسیم اور نفرت بہت گہری ہے۔ بریگزٹ والوں نے یورپی یونین کو مسترد کر دیا تھا لیکن ان سب نے یہ دعوے کیے تھے کہ وہ پوری دنیا کے لیے اپنے دروا کرنا چاہتے ہیں اور نئے سرے سے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں۔ ٹرمپ آزاد تجارت کے مخالف ہونے کے دعوے دار ہیں (حالانکہ وہ ایک طویل عرصے تک اس سے مستفید ہوتے رہے ہیں)۔ وہ اب امریکا کے مختلف تجارتی معاہدوں کو ختم کر دیں گے۔

بریگزٹ ایک مبہم مہم تھی اور اس نے کلنٹن کی غیر جاذب اور کسی وژن کے بغیر کوشش کی طرح مشکل سے ہی متاثر کیا تھا۔ تاہم ٹرمپ ہجوم سے کھیل رہے تھے اور ایک رومن شہنشاہ کی طرح لوگوں کی تفریح طبع کا سامان کر رہے تھے۔ ان کی مہم توانا تھی، اس سے لوگ محظوظ ہو رہے تھے اور یہ کبھی شہ سرخیوں سے غائب نہیں رہی تھی۔ ان کے جارحانہ انداز نے مہم کو اور مہمیز دی تھی۔ اب اس بات کا کم امکان ہے کہ وہ اسی انداز میں حکومت بھی کریں۔

بہرکیف، ان دونوں منصوبوں کو مکمل یا جزوی طور پر ناکام ہوتے ہوئے دیکھنا مشکل ہوگا۔ بریگزٹ سے پورے یورپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے، صرف یورپی یونین ہی کو نہیں۔ عشروں تک وہ مسائل حل نہیں ہوں گے جن کی برطانیہ میں بہت سے لوگ امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ٹرمپ نے اپنی پالیسیوں کے حوالے سے بہت کم لب کشائی کی ہے، اس لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ اپنی موٹی چھوٹی انگلیوں سے کوئی کرتب کر دکھائیں گے اور ان کے ذریعے ایک ہیٹ سے خرگوش نکال باہر کریں گے۔

ترقی پسندوں کو سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ عالمگیریت کو ایک خطرے کے طور پر دیکھتے ہیں اور انھیں اپنی شناخت کے کھو جانے کا بھی خطرہ لاحق ہے۔ امریکا، برطانیہ اور یورپ کے بیشتر ممالک میں آبادی کی بڑی اکثریت تبدیلی پر خوشی سے نہال ہے۔ تاہم اس کے لیے تازہ وژن اور ایک ایسی قیادت درکار ہے، جو حقیقی اور پائیدار تبدیلی لا سکے۔

(بحوالہ: ''العربیہ ڈاٹ نیٹ''۔ ۱۰ر نومبر ۲۰۱۶ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950